نام کتاب	مقدمہ قرآن مجید
مصنف	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
ترتیبِ نو	مجاہد حسین حُر
گرافکس	قلب علی سیال
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی و محترمی ________________ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''مقدمۂ قرآن'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی سعیٔ جمیل کا نتیجہ ہے۔قبلہ مذکور کی تفسیر فصل الخطاب میں سے مقدمۂ قرآن کو الگ کر کے کتابی شکل دے دی گئی ہے۔سرکار سید العلماء اعلی اللہ مقامہٗ کے خطیبانہ و مؤلفانہ فیوض و برکات کا سلسلہ لگ بھگ پچاس سال پر محیط ہے۔آپ کی تقریر و تحریر میں بیان و زبان کی سادگی اور مفاہیم و مطالب کی گہرائی یکساں طور پر موجود رہی ہے یہی وجہ ہے کہ آپ کو برصغیر پاک و ہند کے جمہور مسلمین میں عموماً اور شیعہ مومنین میں خصوصاً مقبولیت اور ادب و احترام نصیب ہوا کہ باید و شاید! قارئین حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور قرآن و عترت کی نصرت اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔-------------------------والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

❁❁❁❁❁

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پہلا تبصرہ

لفظ قرآن کے لغوی تشریح

"قرآن" "قراءة" کی طرح "قُرء" سے ماخوذ ہے جن کے اصلی معنی لغت عرب میں جمع کرنے کے ہیں۔

کتاب کے عام رواج سے پہلے کسی نظم یا نثر کے جمع کرنے کا اس طرح کہ وہ محفوظ ہوجائے۔ بہترین طریقہ یہی تھا کہ اُسے سینہ میں محفوظ یعنی ازبر یاد کرلیا جائے۔

اس بنا پر صدر اسلام میں "قراءة" بمعنی حفظ مستعمل ہوتا تھا اور حافظ قرآن کو "قاری" کہتے تھے۔

چوں کہ یہی حفاظ حروف قرآن کے طریقۂ ادا اور ان کے مخارج و کیفیات سے واقف ہوتے تھے اسے لحن کے ساتھ پڑتے بھی تھے، رفتہ رفتہ قرارۃ بہ معنی علم مخارج حروف ہوگیا اور قاری یعنی مخارج کا جاننے والا چاہے حافظ نہ ہو لیکن یہ بعد کے زمانہ کا محاورہ ہے۔ صدر اسلام میں ایسا نہیں تھا جسے تفصیل کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب "تذکرۂ حفاظ شیعہ" میں لکھا ہے۔

پھر چوں کہ جمع یعنی کسی تحریر پر حاوی ہونے کا ایک ادنیٰ درجہ یہ بھی ہے کہ انسان پوری تحریر پر نظر ڈال لے یا زبان پر اسے جاری کرے، اس لئے "قراءة" کے معنی مطلق پڑھنے کے بھی ہوگئے اور یہ محاورہ بھی نزول قرآن کے پہلے سے موجود تھا چنانچہ پہلی وحی جس کا آغاز اِقْرَاْ سے ہوا ہے اسی مفہوم کی حامل ہے اور بعید نہیں ہے کہ کتاب الٰہی کے لفظ "قرآن" سے موسوم ہونے کا تعلق اس اِقْرَاْ کے ساتھ بھی سمجھا جائے جس سے اس کتاب کے نزول کا آغاز ہوا ہے جس کے ماتحت نمازوں میں "قراءة" کے

معنی اسی کتاب کے سوروں کا پڑھنا ہوا نہ کی تسبیح وغیرہ دوسری چیزوں کا پڑھنا چاہے ان کا پڑھنا واجب بھی ہو۔

جس طرح کتاب بمعنی "مکتوب" اور بیان بمعنی "مَبَيَّن" بلاتکلف استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "قرآن" مقروٴ اور محفوظ کے مفہوم کا اعتبار کرکے خداوندی محاورہ میں نام بن گیا ہے ان الفاظ وکلمات کا جو بطور وحی جبرائیلِ امین کے توسط سے حضرت خاتم النّبیّنؐ پر بحیثیت معجزہ اتارے گئے ہیں۔

قرآن اور حدیث قدسی میں فرق:

اسی آخری قید "بحیثیت معجزہ" سے فرق ہوگیا "قرآن" اور "حدیث قدسی" میں کیوں کہ حدیث قدسی بھی اللہ کی طرف کے ارشادات ہیں جو فرشتے کے ذریعہ رسالت مآب تک پہنچے ہیں لیکن وہ خاص آپؐ کے دعوائے نبوّت کی دلیل بنا کر معجزہ کی حیثیت سے نازل نہیں کئے گئے بلکہ وہ خاص خاص مواقع اور حالات میں خاص خاص ارشادات ہیں جن میں سے بعض رسول کے ساتھ تخاطب کے طور پر ہیں جیسے:

لولاك لما خلقت الافلاك

اگر آپ نہ ہوتے تو میں زمین وآسمان کو بھی پیدا نہ کرتا۔

اور بعض عام بندوں سے تخاطب کی حیثیت سے ہیں جیسے:

عبدی اطعنی حتّٰی اجعلك مثلی

میرے بندے! میری اطاعت کر' تا کہ میں تجھ کو اپنا نمونہ بنادوں۔

اور بعض میں بلا تخاطب کسی بات کا اظہار ہے، جیسے:

لایزال العبد یتقرّب اِلَیَّ بالنّوافل حتّٰی اکون سمعهُ الّذی یسمعُ بهٖ وبصرهُ الّذی یبصر به

بندہ نوافل کے ذریعہ میری بارگاہ میں قریب ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کا سننے والا کان اور دیکھنے والی آنکھ بن جاتا ہوں۔

اسی طرح مشہور حدیث:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ حِصنی فمن دخل حصنی اَمِنَ مِن عذابی.

''لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' میرا قلعہ ہے تو جو میرے قلعہ میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا۔

ان احادیث کا مجموعہ جناب شیخ حرِ عاملی رحمۃ اللہ علیہ کا جمع کردہ ''**الجواھر السنیة فی الاحادیث القدسیة**'' موجود ہے۔

قرآن اور ان احادیث قدسیہ میں جو فرق ابھی بتایا گیا واضح حیثیت رکھتا ہے لیکن غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ''قرآن اور حدیث قدسی'' میں ایک دوسری حیثیت سے بھی فرق ہے جس کی بناء پر دونوں کی نوعیت ہی الگ الگ ہوجاتی ہے اس کی طرف مجمل طور پر ہمارے بزرگوں میں سے جناب تاج العلماء طاب ثراہ کو توجہ ہوئی چنانچہ موصوف نے پہلے تو تحریر فرمایا ہے:

من الحدیث ما یسمّیٰ حدیثاً قدسیًّا وھو ما یحکی کلامه تعالیٰ غیر متحدٍ بشیءٍ مّنه کالقرٰان المقصود بتنزیله ذالك

حدیث کی ایک قسم وہ ہے جس کا نام حدیث قدسی ہے اور یہ وہ ہے جس میں کلام الٰہی کا بیان ہوتا ہے اور اس کے کسی جزء کو اس طرح بطور معجزہ پیش نہیں کیا جاتا جیسے کہ قرآن کو معجزہ ہی کے طور پر نازل کیا گیا ہے۔ (جذہرہ عزیزہ شرح وجزہ ص ۹)

ابھی تک وہی فرق دکھایا گیا ہے جو ہم ابھی درج کر چکے ہیں اس کے بعد

فرماتے ہیں:

ولا یخفی قید الحکایة مغن عن ذکر التحدی لا خراج القرٰان فانّه لیس فی مرتبة الحکایة اللّٰھُمّ الا انّ یراد ان قراءة النّبی بنفسھا حکایة فلا بُدّ من التقیید به لیجدی خروجه

اور واضح ہونا چاہئے کہ کلام الٰہی کے بیان کی لفظ قرآن مجید سے حدیث قدسی کا فرق ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے اس لئے کہ قرآن خود کلام الٰہی ہے نہ کہ کلام الٰہی کا بیان، وہاں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ پیغمبر ﷺ کا قرآن کو پڑھنا خود کلام الٰہی کا بیان ہے لہٰذا حدیث قدسی کی تعریف میں معجزہ کے طور پر نہ ہونے والی قید قرآن سے امتیاز کے لئے ضروری ہے۔ (جذہرہ عزیزہ شرح وجزہ ص ۱۰)

مگر میری نظر میں جس پہلو کی طرف تاج العلماء طاب ثراہ کا ذہن متوجہ ہوا ہے کافی وزن رکھتا ہے۔

قرآن کے سنانے اور حدیث قدسی کے بیان کرنے کی نوعیت میں فرق ہے اس کے سمجھنے کے لئے انسان کو اپنے درمیانی نامہ و پیام کی نوعیّت پر نظر ڈالنا چاہئے۔ اس وقت حقیقت حال کے ذہن نشیں ہونے میں آسانی ہوگی۔

ہم اپنے کسی عزیز دوست خاص یا معتمد ملازم کے ذریعہ سے کوئی پیغام بھیجتے ہیں کہ ہماری طرف سے یہ بات فلاں شخص تک پہنچادو۔ یہاں سفارش کا تعلق درحقیقت ہمارے ذہنی مطلب و مقصد سے ہے۔ الفاظ اس کے اظہار کا ناگزیر ذریعہ ہیں اس لئے وہ جب یہ کہے کہ فلاں شخص نے آپ کے پاس یہ پیغام بھیجا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ الفاظ بالکل وہی ہوں جو ہمارے لب و ذہن سے نکلے تھے بلکہ بعض اوقات اسے الفاظ کی

تبدیلی ضروری ہوگی۔ جیسے اس وقت کہ جب ہماری اور ہمارے اصل مخاطب کی زبان مختلف ہو اور ہمارا پیغام رساں دونوں زبانوں سے واقف ہو تو ہم اس سے اپنا مطلب اپنی زبان میں کہیں گے لیکن اسے اصل مخاطب سے ہمارا مقصد اس کی زبان میں کہنا ہو گا۔ یہاں اس کلام کی نسبت ہماری طرف دے دی جائے گی یعنی وہ فارسی میں کہے تو یہی کہے گا کہ ''فلانی بشما گفتہ است'' اور اردو میں پہنچائے تو کہے گا کہ ''فلاں شخص نے آپ سے کہا ہے''۔

اگر چہ ہم نے اردو یا فارسی میں نہیں بلکہ اپنی بات کو مثلاً عربی میں کہا ہے مگر چوں کہ یہاں الفاظ کا سفارت کے مفاد میں دخل نہیں ہے اس لئے اس کا دوسری زبان میں اس بات کے پہنچانے پر بھی ہماری طرف یہ نسبت دینا کہ انہوں نے آپ سے یہ کہا ہے درست ہوگا۔ یہ ہوتا ہے ''پیغام'' جس میں ''نقل بالمعنیٰ'' یعنی اصل مقصود کو جدا گانہ لفظوں میں بیان کرنے کی سفیر کو گنجائش حاصل ہے۔

دوسری صورت ہوتی ہے ''نامہ'' کی۔ اس کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں معانی کو الفاظ سمیت نقوش کے طلسم میں محفوظ کیا جاتا ہے اور انہی الفاظ کو مکتوب الیہ تک پہنچانے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں اگر ہمارا قاصد خط کو پھاڑ ڈالے اور دوسرا خط اسی مضمون کا تحریر کر دے یا اس کے مطلب کو بلا کم و کاست زبانی جا کر بیان کر دے تو وہ کسی طرح اپنے فرض کو انجام دینے والا اور سفارت ادا کرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ وہ خیانت مجرمانہ کا مرتکب اور بد دیانتی کا ملزم ہوگا۔

زبانی کام میں بھی یہ صورت پیدا ہوسکتی ہے۔ جب کہ غرض کسی نہ کسی طرح الفاظ سے متعلّق ہو جائے مثال کے طور پر یہ ہے کہ ہمارے دوست نے ہم سے ایک دعا دریافت کی تھی ہم نے کسی شخص سے جو وہاں جارہا تھا، کہا کہ ''تم ان سے کہہ دینا کہ آپ صبح

اُٹھ کر یہ دُعا پڑھ لیا کیجئے''۔

یہاں اس جملہ تک کہ آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا کیجئے۔ پہلی قسم کے پیغام کی حیثیت ہے جس میں درمیانی شخص کو الفاظ میں تغیر وتبدیل کا حق ہے لیکن جہاں سے وہ دعا شروع ہوئی ہے۔ پھر درمیانی شخص کو کسی تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ اگر اس نے اس میں کوئی کمی یا زیادتی کی تو وہ ناقابل اعتبار سمجھا جائے گا۔

دوسری مثال: ہمارے کسی شاگرد نے کوئی شعر سنایا تھا اور اصلاح چاہی تھی یا ہم نے خود اس کا شعر سن کر اسے پسند نہیں کیا، ترمیم ضروری سمجھی، ایک درمیانی شخص سے جو جارہا تھا اور شعر یاد رکھنے اور سمجھنے سمجھانے کے قابل تھا، ہم نے کہا کہ فلاں شخص سے کہہ دینا کہ آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے۔

یہاں اتنے الفاظ میں کہ ''آپ اپنے شعر کو اس طرح بنا لیجئے'' درمیانی شخص کو تغیر وتبدیل کا حق ہے۔ مثلاً وہ کہہ دے کہ آپ اپنے شعر میں اس طرح اصلاح کر لیجئے۔ اس طرح ترمیم کر دیجئے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل شعر میں وہ کچھ تغیر وتبدل کر دے، یہ جائز نہ ہوگا۔ اُس کو اُسے اُنہی الفاظ میں پہنچانا چاہئے جو ہم نے اس کے لئے بتلا دیئے ہیں۔

جب یہ دو نوعیتیں معلوم ہو گئیں تو اب ''حدیث قدسی اور قرآن'' کا فرق سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔

''حدیث قدسی'' اللہ کا پیغام ہے جو رسول تک پہنچنا تھا اور پیغمبر اس ارشاد الٰہی کو نقلِ قول کے طور پر دوسروں سے بیان فرماتے تھے اس کی نوعیت پہلی قسم کی ہے اور قرآن کی نوعیت دوسری قسم کی ہے۔ یہاں اصل الفاظ ہیں جو بحیثیت کلام الٰہی رسول پر اترے ہیں یہاں پیغمبر کا کام ان الفاظ کو بجنسہٖ خلق تک پہنچا دینا ہے جیسے کسی نامہ نویس کا خط پڑھ کر سنایا جائے یا بلا تشبیہ کسی شعر کو محفل میں یا کسی شخصِ خاص کے سامنے پڑھا جائے اس کی حیثیت اس کی طرف سے کسی پیام کو پہنچانے کی نہیں بلکہ اس کے کلام کو پیش کر دینے

کی ہوتی ہے۔

''حدیث قدسی'' میں پیغمبرؐ راوی کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے ہم نے ''مسانیدِ معصومین'' میں ''احادیثِ قدسیہ'' کو ''مسند النبی'' کے عنوان کے ماتحت درج کیا ہے اور قرآن مجید میں پیغمبر کی حیثیت راوی کی نہیں ہے بلکہ قارئین کلام کی ہے جو پہلی وحی ''اقراء'' کا منشاء تھا۔

حدیث نبوی اور حدیث قدسی:

ہاں اب ایک چیز ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ خود حدیثِ رسولؐ اور احادیث قدسیہ میں کیا فرق ہے۔ جبکہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کی بنا پر آپؐ کے تمام ہی ارشادات بر بنائے وحی ہوتے تھے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اپنے احادیث میں پیغمبر راویٔ کلام الٰہی نہیں بلکہ خود متکلم ہیں لیکن بمنشائے قدرت یا حکم ربانی سے۔

اب چوں کہ تین چیزیں سامنے آ گئیں:

(۱) حدیث رسولؐ (۲) حدیث قدسی (۳) قرآن مجید

حسب ذیل مثال سے غالباً ان تینوں کا فرق واضح ہو جائیگا۔

آپ نے کسی عالم سے جا کر اپنے دوست کی پریشانی کا تذکرہ کیا، انہوں نے کہا کہ آپ میری طرف سے اپنے دوست سے کہیے کہ وہ روز یہ دعا پڑھا کریں اور وہ دعا آپ کو لکھوا دی یا زبانی یاد کرا دی۔

اب آپ اپنے دوست کے پاس گئے ان سے کہا: ''آپ کی پریشانی دور کرنے کیلئے میں آپ کے لئے بہت اچھا نسخہ لایا ہوں۔ فلاں صاحب سے میں نے آپ کا تذکرہ کیا تھا، انہوں نے ارشاد کیا کہ تم ان سے کہہ دو کے آپ صبح اٹھ کر یہ دعا پڑھ لیا

کریں، اس کے بعد آپ نے وہ دعا سنا دی۔ کلام آیا ہے آپ کی زبان پر مگر اس میں تین قسم کی چیزیں ہیں۔ شروع میں خود آپ کا کلام ہے۔ اس کے بعد ان کا پیغام ہے جن میں آپ اس مضمون کو پہنچانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان میں الفاظ کی خصوصیت نہیں ہے اس کے بعد وہ دعا جو بتانے کی ہدایت ہوئی ہے وہ تیسری قسم کی چیز ہے جس میں الفاظ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ پیغمبر خدا مجمع میں کھڑے ہوئے اور فرمایا:

قد جئتکم بخیر الدنیا والاٰخرۃ

میں تمہارے پاس دنیا و آخرت کی بہتری لے کر آیا ہوں۔

یہ الفاظ ''حدیثِ نبوی'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب مثلاً آپ نے فرمایا، کہ اللہ نے مجھے بڑا رُتبہ دیا ہے اور مجھ سے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لولاك لما خلقت الافلاك

اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔

ہوئی ''حدیث قدسی'' اور اب آپؐ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھ پر یہ کلام نازل فرمایا ہے اور اس کے بعد مثلاً آپؐ نے سورہ مزمل پڑھنا شروع کر دیا تو یہ ہے قرآن۔

یہ سب کچھ دنیا کے گوش زد آپؐ ہی کی زبان مبارک سے ہوتا ہے مگر نوعیت میں ان تینوں چیزوں کی فرق ہے۔

ان تمام قسموں کے الفاظ جب خود پیغمبر خدا ﷺ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور آپؐ سے سننے والوں کے گوش زد تو مقام حقانیت میں ان میں کوئی فرق نہیں تھا اور ہر ایک اس مضمون کے لئے جس سے متعلق ہو دلیل قطعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مگر چوں کہ قرآن مجید میں الفاظ کی خصوصیت تھی، نماز میں اس کا پڑھنا جزو لازم کی حیثیت سے ضروری تھا اور یوں مختلف اوقات میں بھی اس کی تلاوت کو عبادت قرار

دیا گیا تھا اس لئے اس کی بعینہ حفاظت کا اہتمام زیادہ ہوا۔ اسے بروقت صحابہ سے قلم بند کرایا گیا اسے بکثرت افراد نے کُلاًّ یا جُزءً حفظ کیا اس لئے اسے تواتر کا ایسا درجہ حاصل ہوا کہ وہ بحیثیت سند بھی قطعی قرار پا گیا۔ احادیث کو کسی عقیدہ یا حکم شرعی کی سند میں پیش کیا جاتا ہے تو انہیں کم اشخاص نے سنا اور ان سے بھی کم تر اشخاص نے حفظ کیا اس لئے مقام اثبات میں باعتبار سند ان کو وہ قطعیت حاصل نہ ہوئی اور ان میں راویوں کے جانچ پڑتال کا سوال پیدا ہو گیا جس میں احادیث قدسیہ اور احادیث نبویہ بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے سوائے شیخ حر عاملی کی کتاب کے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، یا بعض علمائے اہل سنت کی دو ایک کتابوں کے جنہوں نے احادیث قدسیہ کو جمع کیا ہے۔ ان کے علیٰحدہ مجموعے بھی تیار نہیں ہوئے بلکہ دوسرے احادیث ہی کے ساتھ ان کی بھی متفرق طور پر اندراج ہو گیا۔

قرآن کے اصطلاحی معنی:

قرآن مجید کے یہ اصطلاح معنی کہ ''وہ کلام جو بطور وحی حضرت رسولؐ خدا پر بحیثیت معجزہ اتارا گیا ہے'' ایک ایسے ساری و جاری مفہوم کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے لحاظ سے کُل اور جُزء کم اور زیادہ یہاں تک کہ ایک آیت بلکہ بعض اجزائے آیت بھی ''قرآن'' کا مصداق ہیں بلکہ ایک لفظ پر بھی جبکہ اس کا لکھا جانا جزو قرآن ہونے کے قصد سے معلوم ہو اس لئے فقہ کی رو سے بغیر طہارت اس کا مس کرنا بھی حرام ہو گا لیکن جیسا کہ صاحب معالم کو اس حقیقت کی طرف توجہ ہوئی ہے بظاہر دوسری وضع کے ساتھ یہ لفظ اس پوری کتاب کے نام کے لئے معیّن ہوئی ہے جو اس وحی کے اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس طرح ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت اور ایک ایک سورہ کو پہلے معنی کے لحاظ سے قرآن کہنا درست ہے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے جزء قرآن۔

ہمارے گذشتہ بیان سے یہاں تک یہ پتہ چلا کہ قرآن کے لغوی و اصطلاحی سب ملا کر تین معنی ہیں۔ ایک بمعنی مصدر یعنی جمع کرنا یا محفوظ کرنا۔ دوسرے وہ ساری و جاری عام مفہوم جس کے لحاظ سے ایک ایک جملہ اور ایک ایک حرف قرآن ہے۔ تیسرے اس پوری کتاب کا نام خود قرآن کریم میں لفظ قرآن کے ان تینوں معنوں کی سند موجود ہے۔

(۱) اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ.

یہاں لفظ قرآن کی اضافت کتاب کی طرف اور جمع پر عطف بتا رہا ہے کہ اس کے معنی مصدری یعنی ضبط و حفظ مراد ہیں۔

(۲) اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ (سورۂ واقعہ)

یہاں قرآن وہی جامع اور عام مفہوم مراد ہے جو جزء وکل سب پر صادق ہے اور اسی لئے بغیر طہارت مس کرنے کی ممانعت کل قرآن سے مخصوص نہیں بلکہ اجزاء قرآن میں ثابت ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝

(سورۂ حجر)

ہم نے آپ کو عطا کیں سات دورنگ والی آیتیں اور قرآن عظیم

یہاں قرآن کا اطلاق مجموعہ کتاب پر ہے جس سے سورہ حمد کا صرف بنظر اہمیت وخصوصیت الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اور قرآن کے اسی لحاظ سے حضرت علیؑ کا قول وارد ہوا ہے کہ جو کچھ قرآن میں ہے وہ سورہ حمد میں ہے جس کی تشریح انشاء اللہ سورہ حمد کی تفسیر میں سامنے آئے گی۔

دوسرا تبصـــرہ

کلام الٰہی کے معنی اور قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کا معرکہ

چوں کہ یہ دونوں مسئلے مبادی ومقدمات کے لحاظ سے ایک ہی بنیادی اساس پر مبنی ہیں اس لئے ہم ان کو سمو کر عام فہم طور پر واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے لئے ذیل کے دو مقدموں کا سمجھنا ذہن نشین کرنے کے لئے ضروری ہے۔

(۱) صفات ثبوتیہ:

سنی اور شیعہ دونوں کے علم کلام کی کتابوں بلکہ چھوٹے دینیات کے رسالوں تک میں ''اللہ کے صفات'' کا ذکر ہوتا ہے اور بچوں کو یاد کرایا جاتا ہے کہ اللہ کے اتنے ''صفات ثبوتیہ'' ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں پائی جاتی ہیں اور اتنے ''صفاتِ سلبیہ'' ہیں یعنی وہ باتیں جو خدا میں نہیں پائی جاتیں۔ صفات ثبوتیہ کی تعداد آٹھ بتائی جاتی ہیں اور ان میں عالم، قادر، حیٔ، مرید مدرک وغیرہ کے ساتھ متکلم بھی آتا ہے

(۲) صفات الٰہی کے بارے میں اختلاف

صفات الٰہی کے بارے میں شیعی نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ عین ذات ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بس ذات الٰہی ہے جس کے کمال کے مختلف پہلوؤں کی تعبیر مختلف صفات سے ہوتی ہے اس طرح بس مقام لفظ میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں مگر مقام حقیقت

میں ذات کے علاوہ صفات کوئی چیز نہیں ہیں۔ جیسا کہ امام الالٰہیّین حضرت علی ابن ابیطالبؑ کا ارشاد ہے جو نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبہ میں درج ہے کہ:

من کمال الاخلاص له نفی الصفات عنه لشهادة کل صفة انّها غیر الموصوف و شهادة کل مو صو ف انّهٗ غیر الصفت.

اللہ کی خالص توحید کی تکمیل اس سے ہے کہ اس سے صفات کی نفی کرے کیونکہ موصوف اور صفت کے الفاظ باہم مغایرت کا پتہ دیتے ہیں اور اللہ میں ذات سے مغایر کوئی چیز نہیں ہے۔

اہل سنّت قائل ہیں کہ یہ آٹھ صفتیں ذات کے علاوہ وجود رکھتی ہیں۔ اس طرح ایک ذات الٰہی ہے اور آٹھ صفتیں اور یہ سب قدیم ہیں یعنی ان کی ہستی ہمیشہ سے ہے۔ کیونکہ اگر ان کا وجود عدم کے بعد مانا جائے تو وہ مخلوق ہوگی اور اس طرح ان کی خلقت کے پہلے اللہ نہ عالم ہوگا نہ قادر ہوگا، نہ حیٔ ہوگا، نہ مدرک ہوگا وغیرہ وغیرہ

نتیجہ:

ان دونوں مقدموں سے اہل سنت کے نقطہ نظر سے نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ کلام الٰہی قدیم ہے کیونکہ وہ خالق کی صفت ہے اور جتنے صفات الٰہیّہ ہیں وہ قدیم ہیں اور قرآن ہے کلام اللہ لہٰذا قرآن کو مخلوق کہنا کفر ہے۔

کلام الٰہی کیا ہے؟

اب دیکھنا ہے کہ کلام جو اللہ کی صفت ہے اس کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟

''ہمارا کلام'' ہمارے لب ودہن سے نکلتی ہوئی آواز ہے جو مختلف مقاطع پر رکتی

ٹھہرتی، بڑھتی گھٹتی ہوئی مختلف حروف کی تشکیل کرتی اور ان سے مختلف الفاظ کی صورت گر
ی کرتی ہے اس کی سیّال ہستی ہے۔ وہ بے ثبات وجود رکھتا ہے اس کا ہر دوسرا جزء بغیر پہلے
جزء کے فنا ہوئے آنہیں سکتا۔ اس کا ہر حاضر بات کہتے کہتے غائب اور ہر حال زبان
ہلانے کے ساتھ ماضی ہو جاتا ہے۔

ہمارا وجود غیر مستقل ہے اور ہماری ہستی خود نفس کے آمد و شد کی رہینِ احسان
ہے۔ اس لئے ہمارا کلام بھی یہ ہو سکتا ہے۔ ہم اعضاء و جوارح کے پابند ہیں، ہم جسم و
جسمانیات سے بے نیاز نہیں ہیں۔ اس لئے ہماری زبان بھی، تالو بھی، حلق بھی ہے اور حنجرہ
بھی، ذہن کی فضا بھی ہے اور اس میں آواز بھی حادث ہیں تو محلِ حوادث بھی، اس لئے
ہمارا کلام وہی ہے جو ہمارے دہن سے نکلے ہماری زبان سے صادر ہو اور ہماری آواز کے
ساتھ مخاطب کے گوش گزار ہو۔

''خدا کا کلام'' بھی اگر اسی حیثیت سے سمجھا جائے تو اس میں اور ہم میں فرق
کیا رہا۔ غیر مستقل وجود کے ساتھ فوراً ہی سپرد عدم ہو جانے والے الفاظ آواز کے اتار
چڑھاؤ کی پیداوار، ان کا مرکز ذات احدیت ہو تو وہ خود تغیر سے بری حوادث کے دسترس
سے بلند و برتر قدیم و سرمدی کب رہ جائے گا؟

وہ محل حوادث ہو تو عقلی طور پر خود بھی حادث قرار پائے گا۔

اس لئے کسی باہوش انسان کی یہ مجال نہیں کہ وہ خدا کے کلام کے معنی اس کے
دہن سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات قرار دے۔ پھر اس کا کلام کیا ہو سکتا ہے؟

فرقۂ اشاعرہ نے جس کے معنی اب جمہور اہلسنت کے ہیں (کیونکہ ان میں کا
دوسرا فرقہ یعنی معتزلہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس کا دنیا کے کسی خطہ میں غالباً وجود نہیں
ہے) اس کا حل ''کلام نفسی'' کی صورت میں تجویز کیا۔

کلام نفسی کا تصور:

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ الفاظ و کلمات کا سلسلہ جو ہماری زبان پر آتا ہے یہ
پورا سلسلہ اسی شکل و صورت میں ہمارے ذہن کے اندر موجود ہوتا ہے۔ خدا چوں کہ زبان
و دہن نہیں رکھتا، اس لئے یہ صدائیں اس کی ذات میں نہیں پائی جاسکتیں، مگر یہ اندرونی
قسم کا سلسلہ کلام کا اس کی ذات میں اس کے علم و قدرت کی طرح ازل سے موجود رہتا ہے۔
یہ اصل میں خالق کی صفت ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قدیم ہے۔

یہ امکانی حد تک ان کے مسلک کی تشریح ہے جو ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا
ہے۔ علاّمہ نیشاپوری ''غرائب القرآن'' میں لکھتے ہیں:

منکرو الکلام النفسی اتفقوا علی اَنَّ الکلام اسمہ لھذا
الالفاظ و الکلمات والاشاعرۃ یثبتون الکلام
النفسی و یقولون اَنَّ الکلام لفی الفؤاد و انما جعل
اللسان علی الفؤاد دلیلا۔

کلامِ نفسی کا انکار کرنے والے اس پر متفق ہیں کہ کلام ان الفاظ اور کلمات کا
نام ہے اور اشاعرہ کلام نفسی کو ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل کلام دل میں ہوتا ہے
اور زبان تو بس اس دل والے کلام کو ظاہر کرنے والی قرار دی گئی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اصلاً
علم کلام کی بحث ہے جو الٰہیات سے متعلق ہے اس لئے یہاں اس کی مکمل جانچ نہیں ہو سکتی
مگر جہاں تک ہمارے موضوع کتاب سے تعلق ہے، یہ سوال ضرور اہمیت رکھتا ہے کہ با
لفرض یہ کلام نفسی جو ازل سے موجود بتایا جاتا ہے بجائے خود کوئی معقولیت رکھتا ہو مگر جس
بناء پر خالق کو متکلم ماننے کی ضرورت ہے یعنی ارشاد قرآنی۔

كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿١٦٤﴾

اللہ نے موسیٰ سے پورے طور پر کلام کیا۔ (سورۂ نساء)

تو آخر اس ازلی وجود کو جو ذات کے ساتھ تھا، طور پر جانے کے بعد موسیٰ سے کیا تعلق پیدا ہوا جو وہ اس وقت سے کلیم اللہ قرار پائے اور اس کلام ازلی کا آخر میں حضرت پیغمبر خدا ﷺ سے کیا ربط قائم ہوا جس سے قرآن جو حضرت پر باقساط پورے دَورِ رسالت میں تدریجی طور پر نازل ہوا کلام اللہ ہو گیا۔

شیعی نقطۂ نظر

شیعہ بنیادی حیثیت سے شروع سے آخر تک ان نظریات کے خلاف ہیں۔ ہم تو ذات الٰہی کو قدیم ہونے میں یکتا اور ازلی ہونے میں لاشریک جانتے ہیں۔ ہم اس کی ذات کے لئے صفات قرار ہی نہیں دیتے جو اس کی ذات کے علاوہ قدامت کا درجہ رکھتے ہوں تو کلام کو کسی بھی معنی میں اس کی ذات میں قائم کیوں کر مان سکتے ہیں۔

ہم خدا کے متکلم ہونے کے معنی صرف یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خالق کلام ہے اور جس کلام کو وہ اپنی طرف انتساب کے ساتھ خلق فرمائے وہ اس کا کلام قرار پاتا ہے۔

اب یہاں جبر واختیار کی منزل میں چوں کہ ہمارا اور اہلسنت کا راستہ الگ الگ ہے، لہٰذا ہماری اس تشریح میں کہ خدا خالق کلام ہوتا ہے انہیں کوئی خصوصیت محسوس نہ ہوگی۔ وہ کہیں گے کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ خدا ہر اس گفتگو کا جو کسی انسان کی زبان سے صادر ہوتی ہے، خالق ہے، لہٰذا یہ سب ہی کلام کلام اللہ قرار پاتا ہے لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ ہم انسانوں کے ذاتی افعال واقوال کا ذمہ دار خود انسانوں کو سمجھتے ہیں اور ان کا وجود میں لانے والا خود انہیں کو جانتے ہیں ان کو اللہ کے ساتھ اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ اعضاء وجوارح اور آلات وذرائع جن سے اعمال واقوال صادر ہوتے ہیں، خدا کے مخلوق ہیں

لیکن ان افعال واقوال کا خود صدور ہر گز خداوند عالم کی ایجاد وتخلیق کا نتیجہ نہیں۔

اس طرح یہ دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ ایک قید ہم اور لگا چکے ہیں۔ خدا کا کلام وہ سمجھا جائے گا جو انسانی ارادہ واختیار کارگزاری اور صناعی سے خارج ہو اور پھر خداوند عالم کی طرف سے بحیثیت متکلم اس کا استناد نمایاں ہو۔ لہٰذا گر آواز اس کی قدرت خاص سے کسی شئے میں پیدا ہوئی مگر نسبت اس کی اللہ نے اپنی طرف نہیں دی تو وہ باوجود مخلوق الٰہی ہونے کے منسوب اسی شئے کی طرف ہوگی جس میں وہ آواز پیدا ہوئی ہے۔ جیسے سنگریزوں کا دست رسالت مآبؐ میں تسبیح پڑھنا سوسمار کا آپ کی رسالت کی گواہی دینا وغیرہ۔ (جیسا کہ بعض روایات میں ہے)۔ یا بچہ کا پاک دامنی یوسفؑ کی گواہی دینا۔ (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکورہ ہے مشہور تفسیر کی بناء پر) اور حضرت داؤدؑ کے ساتھ دیوار ودر، صحرا وفضا کا مشغول حمد وتسبیح ہونا، اس سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے یوں کہا جائے گا کہ سنگریزوں نے قدرت خدا سے تسبیح کی، بچہ نے قدرت خدا سے گواہی دی، دیوار ودر نے قدرت خدا سے حمد و تسبیح ادا کی۔ ان سب کو کلام الٰہی کہنا درست نہ ہوگا۔ بلکہ اسے ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں براہ راست کلام خلق نہیں کیا جاتا بلکہ اس شئے میں کلام کرنے کی طاقت خلق کی جاتی ہے جس کی بناء پر کلام وہ خود اسی شے کا ہوتا ہے، خدا کا کلام نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خداوند عالم نے وہ کلام اپنی طرف نسبت کے ساتھ خلق فرمایا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ نے اس شئے کو اپنا ترجمان قرار دیتے ہوئے جو بات اسے کہنا تھی اسے بطور آواز اس شئے میں خلق کر دیا۔ جیسے درخت میں سے آواز موسیٰ کے لئے إِنِّىٓ أَنَا رَبُّكَ ...الی آخرہ بے جان چیز کی آواز ہو بہو، خدا کی قدرت خاص کا نتیجہ۔ پھر طرز کلام، لب ولہجہ، عنوان تخاطب سے ظاہر کہ آواز کا محل درخت ہے مگر کلام کسی اور کی طرف سے ہے۔ نہیں تو درخت خود خدا ٹھہرتا۔ موسیٰ کا پروردگار خود درخت بن جاتا۔ لیکن حضرت موسیٰ معرفت رکھتے تھے۔ درخت کے سامنے

سرنگوں نہیں ہوئے۔ سمجھے کہ درخت مجازی پردہ ہے جس میں متکلم حقیقت اپنی خلق کی ہوئی آواز کے ساتھ مصروف کلام ہے۔ یہ خدا کا پہلا کلام تھا اور اس کے بعد بھی جب گفتگو ہوئی تو ایسی ہی کسی شئے کے ذریعہ سے جس طرح طُور پر گفتگوئیں ابر کی صورت سے ہوئی تھیں، جیسا کہ توریت میں تذکرہ ہے۔

یہ صورت وہ تھی جہاں کلام کا مظہر بے شعور وارادہ ناقابل تکلم شئے ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کلام کسی ذی شعور با ارادہ و اختیار، قابل نطق و تکلم انسان کی زبان پر آئے اور ہمارے گوش زد ہو، مگر کلام ایسا ہو کہ جو اس انسان کے ارادہ و اختیار کا نتیجہ قرار نہ پا سکتا ہو اور وہ کہتا بھی ہو کہ یہ میرا کلام نہیں ہے بلکہ اس کا انتساب خالق کی جانب ہو تو یہ کلام بھی خداوند عالم کا کلام قرار پائے گا جس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنے کلام کا حامل وترجمان اس انسان کو قرار دیا ہے۔

اب عقلاً اس کی کئی صورتیں متصور ہیں۔

ایک یہ کہ براہ راست اس رسول کی زبان پر اس کلام کو خلق فرمائے لیکن اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ وہ کچھ عرصہ تک رسول کی زبان اور ان کے دل و دماغ سے ذاتی ارادہ و اختیار کو سلب کر کے اسے مسخر بنانے اور قہری وغیر اختیاری طور پر کچھ الفاظ کو ان کی زبان پر جاری کرے اس لئے کہ اگر ارادہ و اختیار باقی رہا اور اس کی شرکت سے کلام ظہور میں آیا تو وہ اس انسان کا کلام ہوگا نہ کہ اللہ کا کلام۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی غیر ذی روح ہستی مثلاً دیوار و در پتھر وغیرہ میں خلق کیا جائے اور رسول کے گوش گزار ہو۔

تیسری صورت یہ ہے کہ کلام قدرت کی طرف سے عالم اعلیٰ کے کسی محل میں خلق ہو اور پھر کسی ذریعہ سے رسول تک پہنچایا جائے۔

پہلی صورت ایک کامل انسان اور مصلح خلق کے لائق نہیں ہے کیوں کہ ایک

صاحب شعور و اختیار کا ایک وقت میں اپنی زبان پر بالکل بے قابو ہو جانا کمال انسانی کے خلاف ہے۔ پھر یہ کہ حکمت الٰہی کے اقتضا سے رسولؐ کی تبلیغ و تعلیم مصلحت وقت کے لحاظ سے ہونا ضروری تھی۔ اس لئے کلام الٰہی کے اجراء کے لئے ایسی صورت ہونا چاہئے تھی کہ اس کا پہنچنا رسولؐ تک ہر وقت اور ہر موقع پر ہو سکتا ہو اور آپؐ کی زبان سے اس کی تبلیغ اشخاص اور حالات کو دیکھ کر محدود یا غیر محدود طور پر ہوا کرے۔ یہ بات پہلی صورت میں نہیں ہے اسی طرح دوسری صورت میں بھی یہ بات پورے طور پر حاصل نہیں ہو سکتی۔ بنی اسرائیل کے ضروریات محدود تھے حضرت موسیٰؑ کے لئے ایک خاص وقت کا تقرر ہو گیا کہ وہ طور کی چوٹی پر چلے جاتے تھے۔ اَبر آتا اور اُن تک کلام پہنچتا۔ اب وہ واپس آ کر جن جن باتوں کی تبلیغ کی ضرورت ہوتی اپنی امت کو تعلیم دیتے تھے۔ ہمارے رسولؐ کے لئے یہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔

ان کو دین و دنیا کی ضروریات پر حاوی ایک نظام کا حامل بنایا گیا تھا اس لئے ان میں اور افراد خلائق میں ہر وقت رابطہ قائم رہتا تھا اور طرح طرح کے اشخاص آپ ﷺ کو گھیرے رہتے تھے اور خلوت، جلوت، سفر و حضر، منزل و طریق ہر موقع و محل پر کلام الٰہی کے آپ ﷺ تک پہنچنے کی ضرورت تھی لہٰذا کسی جسمانی چیز اور دیوار و در، درخت اور پتھر، ہوا اور اَبر میں۔۔۔آواز کا پیدا کرنا حکمت ربانی کے خلاف تھا۔ اس لئے آپؐ کے لئے کلام الٰہی پہنچانے کا تیسرا طریقہ اختیار کیا گیا۔

الفاظ کی خلقت اور وہ بھی ضروری نہیں کہ آواز کی صورت میں ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ یہاں مبدا خلقت میں نقوش ہی پیدا کئے گئے جو آواز نہیں ہوتے بلکہ آوازوں کی علامت ہوتے ہیں اور اسی کے اعتبار سے اس کلام کا نام ''کتاب'' ہوا ہوا اور اس کتاب کو قرآن میں ''مکنون'' (چھپا ہوا) کہا گیا ہوا اور اس کے محل کا نام ''لوح'' بتایا گیا اور تحریر چوں کہ ''قلم'' سے وابستہ ہوتی ہے لہٰذا قرآن میں سب سے پہلے وحی میں اس کا ذکر آیا کہ

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ''قلم کے ذریعہ سے اس نے علم کا سرمایہ فراہم کیا۔

اور حدیث میں آیا۔

اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ

سب سے پہلے جسے اللہ نے پیدا کیا وہ قلم ہے

اور یہ بات ہے کہ اس ملاء اعلیٰ کی چیزوں کو پوری نوعیت و کیفیت کو اس عالم مادی میں محصور ہونے کی حالت میں ہم نہیں سمجھ سکتے۔

کال کوٹھری میں پیدا ہو کر آنکھ کھولنے والا ''صحن''، ''میدان''، ''صحرا اور فضا'' کو لفظاً سن سکتا ہے اور اجمالی طور پر (بشرطیکہ کہنے والے پر اعتماد رکھتا ہو) اتنا سمجھ بھی لے گا کہ یہ سب چیزیں ضرور کچھ ہیں، کیا ہیں۔ اس کا نہ وہ صحیح تصور کر سکتا ہے نہ اسے ان چیزوں کا تصور کرایا جا سکتا ہے، ایسے ہی بیت معمور، لوح محفوظ، لوحِ محو و اثبات وغیرہ سب غیبی نام کی چیزیں ہیں جن کو اجمالی طور پر کہنے والے (معصوم رہنمایانِ دین) پر اعتبار (ایمان) کی شرط کے ساتھ ماننا ضروری ہے مگر ان کی حقیقت کے سمجھنے کا مطالبہ ایک دور از کار اپچ کی بات ہے۔

بہرحال یہ یقینی ہے کہ وہ لکڑی، تانبے، لوہے یا سونے، چاندی کی کوئی تختی نہیں ہے بلکہ وہ عالم روحانیات سے متعلق چیز ہے۔ آسمانی فرشتوں کے پڑھنے کے قابل وہ قرآن کا مرکز اول ہے جہاں قرآن کا وجود پہلے ہو چکا۔

نزول قرآن کے معنی

پھر جب رسولؐ مبعوث بر سالت ہوئے تو موقع و محل کے اقتضاء سے جیسی ضرورت پیش آئی اور جیسا موقع درپیش ہوا ملک مقرب یعنی جبرائیلِ امین رسولؐ تک اس کے پہنچانے پر مامور ہوئے اور اسے نازل ہونا کہتے ہیں۔

وحی کی صورتیں

اگرچہ روایات بتاتے ہیں کہ اکثر جبرائیل امین وحیہؑ کلبی کی شکل میں مجسم صورت سے بھی آئے ہیں مگر تنزیل قرآن کے لئے ان کا اس طرح آنا ضروری نہ تھا۔ نہ یہ لازم تھا کہ وہ آواز کے ساتھ رسولؐ کو آ کے قرآن کی آیتیں سنائیں بلکہ فرشتہ اپنی مشاہدہ انسانی کے ماوراشکل میں بھی آتا اور پیغمبرؐ کے دل و دماغ سے براہ راست رابطہ قائم کر کے کلام الٰہی پہنچاتا۔ اس لئے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِكَ.

اسے جبرائیلؑ امین نے آپؐ کے دل پر اتارا ہے (شعراء۔ ۱۹۳)

جب پیغام زبانی پہنچے ملک کے ذریعہ سے یعنی وہ آ کے کوئی سورہ یا آیت رسولؐ تک پہنچائے، تب بھی وہ کلام الٰہی اس اعتبار سے ہے کہ یہ الفاظ جو ملک کی زبان پر آ رہے ہیں وہی ہیں جو دستِ قدرت سے لوح محفوظ پر تحریر ہوئے ہیں۔

اسی نسبت کے لحاظ سے وہ کلام اللہ ہے اور مرکز اعلیٰ سے وہ بذریعہ ملک آتا ہے۔ رسولؐ تک اس لحاظ سے منزل من اللہ ہے (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ) اور جبرائیل امین کے ذریعہ سے اترا ہے۔ اس لئے ارشاد ہوا: ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ'' اور رسولؐ کے گوش گزار ہونے کی صورت میں وہ جبرائیل کی زبان کا ہے۔ اس لئے اس کی نسبت جبرائیل کی طرف بھی دی گئی ہے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ ﴿۱۹﴾ ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ ﴿۲۰﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ ﴿۲۱﴾

لیکن عین اس وقت کہ جب وہ رسولؐ کے گوش گزار ہوتے ہوئے ''قول روح

الامین‘‘ ہے۔ چوں کہ وہ قول ترجمان ہے اسی کلام کا جو خالق متعال کی جانب سے اس سے پہلے وجود میں آچکا ہے۔ وہ کلام جبرائیل نہیں بلکہ کلام رب العالمین ہے۔

خلق قرآن کا معرکہ

ہمارے نزدیک صفات الٰہی میں بحث اور کلام نفسی کے تصور یا عدم تصور کا بھی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ خلق قرآن کا مسئلہ اس طرح نزاعی بن جائے جیسا کہ بنا اور جس کی تفصیل بقدر ضرورت ابھی سامنے آئے گی۔

شیعہ نقطۂ نظر سے تو ظاہر ہے کہ ہم متکلم ہونے کے معنی ہی خالق کلام کے قرار دیتے ہیں لہٰذا کسی بھی معنی سے کلام کے غیر مخلوق ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ صفات ثبوتیہ میں اس کا شمار بھی تحقیقی حیثیت سے شیعی مسلک کے لحاظ سے درست نہیں ہے اس لئے کہ توحید کے عنوان کے ماتحت جو صفات بیان کیئے جاتے ہیں وہ صفات ذات ہیں۔ اللہ کا متکلم ہونا جب کہ بمعنی خالق کلام ہے تو وہ صفات افعال میں سے ہے۔ صفات افعال جتنے ہیں وہ اصول دین میں سے دوسری اصل عدل میں مندرج ہیں۔ لہٰذا متکلم مثل رؤف، رحیم، رازق، خالق وغیرہ کے، ان اسمائے حسنیٰ میں سے ہوسکتا ہے جو افعال الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں۔

بعض دینیات کی کتابوں میں صفات ذات میں درج کرنے کی معقولیت کے لئے متکلم کے معنی یہ لکھے ہیں کہ وہ جس چیز میں چاہے کلام پیدا کرے یعنی اسے قدرت کی طرف راجع کیا ہے مگر اس صورت میں متکلم کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ خالق بھی اس معنی میں صفات ثبوتیہ میں ہونا چاہیئے کہ وہ جو چاہے پیدا کرے اور رازق بھی اس معنی سے کہ وہ جسے چاہے رزق دے اور محی اور ممیت، معطی اور صانع، مبدی اور معید وغیرہ بھی۔

اصل یہ ہے کہ یہ آٹھ صفات ثبوتیہ کی فہرست ہمارے ائمہ معصومینؑ یا اُن کے

پیرو علماء کی مرتب کی ہوئی ہے ہی نہیں بلکہ ہمارے علماء کو جب علم کلام میں کتابیں لکھنے کا موقع ملا تو اہل سنت کے علم کلام کی کتابیں موجود تھیں جن میں صفات ثبوتیہ کا عنوان قائم کر کے آٹھ صفتیں درج کی گئی تھیں ہمارے علماء کو ان میں سے ہر چیز کے متعلق اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لئے تصنیفی حیثیت سے اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ ان میں سے ہر عنوان کو بجنسہ ایک سرخی بنا کر اس کے تحت میں جو اپنا نقطہ نظر اور مخالف افراد سے رد و قدح ہے اسے پیش کریں۔ اس بناء پر ان آٹھ صفات کی سرخیاں قائم کی گئیں اور پھر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصل حقیقت میں ذات کے علاوہ کچھ صفات ہیں ہی نہیں اور مقام مفہوم میں تمام صفات کا مرجع صرف دو صفتیں ہیں۔ علم اور قدرت باقی سب انہیں کی شاخیں ہیں اور متکلم ہونا جس معنی سے درست ہے وہ صفت ذات نہیں بلکہ صفت فعل ہے جسے بلا وجہ صفات ثبوتیہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ صاف صاف شیعی نقطہ نظر ہے۔ اب آیئے! اہلسنت کے نقطہ نظر سے دیکھیں۔

قطع نظر اس بنیادی اختلاف سے جو ہمیں ان سے صفات کے بارے میں خاص متکلم کے صفات الٰہی میں درج ہونے کے سلسلہ میں ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اسمائے الٰہی کے طور پر بحیثیت وصفت جیسے: **الخالق الباری المصور۔ المومن المھیمن العزیز۔ الجبار المتکبر** ہے۔

اس طرح کہیں قرآن میں **المتکلم** کا لفظ نہیں ہے جو کچھ بھی ہے وہ بطور فعل اس کی طرف اسناد ہے جیسے: **كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا**۔ یا بحیثیت اضافت **حتّٰی یسمع کلام اللہ** تو اب جو شے افعال الٰہی میں داخل ہوتی ہے وہ **کلّم** کا مصدر یعنی **تکلیم** اور یہ کام جس شے سے متعلّق ہوتا ہے وہ کلام ہے۔ تو جس طرح خلق فعل الٰہی ہے جو متعلق ہوتا ہے مخلوق مثلاً **سما و ارض** سے تو اس کی وجہ سے **سماء و ارض** نہ صفات الٰہی میں داخل ہوتے ہیں نہ ان کے قدیم ہونے کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

عطائے رزق اللہ کا فعل ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ. لیکن اس کی وجہ سے وہ اشیاء جو متعلق فعل رزق ہوتے ہیں صفت الٰہی نہیں بنتے۔ نہ قدیم قرار دیئے جا سکتے ہیں تو اسی طرح تکلیم ایک فعل ہے جو کلام سے متعلق ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اس فعل کا متعلق یعنی کلام صفات میں کیوں قرار پائے اور اس کے قدیم ہونے کا تصور کیوں کیا جائے؟

اب جب کہ کلام کے صفت الٰہی ہونے ہی کی از روئے قرآن کوئی بنیاد نہیں ہے تو کلام نفسی کے اختراع کی کوئی ضرورت پیدا نہیں ہوتی لیکن کلام نفسی ماننے کے بعد پھر بھی یہ بات تو متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہونا چاہئے تھی کہ یہ الفاظ وکلمات جو مجتمعہ حیثیت سے بحالت موجودہ ''قرآن'' کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جو کاغذ پر لکھے جاتے، سینہ میں محفوظ کئے جاتے، زبان سے پڑھے جاتے ہیں، یہ حادث ہیں قدیم نہیں۔ اس لئے کہ اگر یہی قدیم ہوتے تو اکثریت کو خدا کے متکلم ثابت کرنے کی غرض سے کلام نفسی کے ایجاد کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آتی۔

یہ الفاظ حادث ہیں اور خدا محل حوادث نہیں۔ اسی لئے تو کلام نفسی کے تخیل کی ضرورت ہوئی اور جب یہ الفاظ حادث ہیں تو ہر حادث کے لئے موجد اور خالق کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مخلوق بھی ضرور ہوں گے۔

یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں تھا جس میں خواہ مخواہ کی الجھنیں پیدا ہوتیں لیکن افسوس ہے کہ بحث ونظر کے سد باب اور قوائے عقلی کے تعطل نے جسے قرآن اور تعلیمات نبویؐ کے بالکل برخلاف بظاہر کچھ سیاسی مصالح سے رسالت مآبؐ کے بعد ضروری سمجھا گیا تھا اکثر مسلمانوں کے فکر ونظر کی قوتوں کو اس درجہ بے کار کر دیا تھا کہ وہ معنی اور مفہوم پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے سے قاصر ہو کر الفاظ اور تعبیرات کے غلام ہو گئے تھے۔ لہٰذا وہ قرآن کو مخلوق کہنا اس کی توہین سمجھتے اور بہت بڑا جرم خیال کرتے تھے۔

چنانچہ علامہ نیشاپوری نے اپنی تفسیر ''غرائب القرآن'' کے مقدمات میں دسواں مقدمہ اسی بحث میں لکھا اور اس میں تحریر کیا ہے:

ذکر قومه من ائمة الامة ان کلامه الله تعالیٰ قدیمه بعد ان عنوا بکلامه هذه الحروف المنتظمة المسموعة اما ان کلامه تعالیٰ هو هٰذه الحروف فلقوله تعالیٰ اوان احد من المشرکین استجارك فاجره حتٰی یسمع کلامه الله و معلومه ان المسموع لیس الّا من هذه الحروف واما انها قدیمة فلان الکلامه صفة الله تعالیٰ و من المحال قیامه الحادث بالقدیمه و ایضا کل حادث متغیر والتغیر علیٰ ذات الله تعالیٰ وصفاته محال

اسلامی جماعت کے بڑے پیشواؤں میں سے بہت سوں نے کہا ہے کہ اللہ کا کلام قدیم ہے اور پھر کلام سے ہی مرتب حروف مراد لئے ہیں جو سنائی دیتے ہیں۔ یہ کہ کلام الٰہی یہی حروف ہیں، اس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن میں ہے ''مشرکین میں سے اگر کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجئے۔ یہاں تک کہ وہ کلام خدا سنے اور ظاہر ہے کہ جو چیز سنی جاتی ہے وہ یہی حروف ہیں اور یہ کہ وہ قدیم ہیں اس بناء پر ہے کہ کلام اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور حادث کا قیام قدیم میں محال ہے اور نیز ہر حادث متغیر ہے اور تغیر ذات الٰہی اور اس کے صفات میں محال ہے

اب ملاحظہ کیجئے کہ یہ نقطہ نظر جو بیان کیا گیا ہے اس میں اول اور آخر میں کیسا ٹکراؤ ہے۔ کلام الٰہی یہی حروف ہیں جو سنے جاتے ہیں اور پھر وہ قدیم ہیں اس لئے کہ اللہ

کی صفت ہیں یعنی وہ صفت اللہ سے الگ ہو کر ہمارے پردہ گوش سے ٹکراتی ہے یا اللہ سبحانہ (معاذ اللہ) اس صفت سمیت آ کر ہمارے آلہ سماعت سے متصل ہوتا ہے۔ پھر یہ حروف اس وقت ہمیں سننے میں آ رہے ہیں تو وجداناً وہ حادث ہیں اور حادث ذات الٰہی میں قائم نہیں ہو سکتا۔

پھر بھی یہ ماننا ضرور ہے کہ یہی آوازیں کلام اللہ ہیں اور وہ قدیم ہیں۔ ان تمام باتوں کو بیک وقت قبول کرنا بغیر عقل کو ''خیر باد'' کہے ہوئے کیوں کر ممکن ہے مگر علماء کا جم غفیر بھیڑ یا دھسان طور پر یہ سب مان رہا تھا اور اسے داخل عقائد مسلّمات کر رکھا تھا۔

یہ سادگی کا طلسم مسلّمہ عقیدہ کی صورت میں خاموش اطمینان کے ساتھ قائم رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں مامون الرشید خلیفہ المسلمین عباسی کا ذوق تحقیقی اس کے خلاف مصروف جہاد نہ ہوتا۔ یہ خلیفہ اپنے پیش رَو دوسرے اموی و عباسی خلفاء کے برخلاف لہو ولعب اور عیش وعشرت میں مصروف ہونے کے بجائے ایک حد تک علمی تحقیقات اور وسعتِ علوم وفنون کا دلدادہ تھا۔ اس نے علم حدیث اور فقہ کی تحصیل بڑی تکمیل کے ساتھ کی اور فلسفہ وحکمت میں کافی وقت صرف کیا تھا۔

(تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۳۱۰)

اس کی آنکھوں میں ایسی باتیں کھٹکتی تھیں جن کی بنیاد صرف عقل کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے پر قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن کے زیر بحث مسئلہ پر اس نے سنجیدگی سے غور کیا اور الفاظ قرآن کے قدیم وغیر مخلوق ہونے کو ایک لایعنی خلاف عقل بات قرار دے کر یہ اعلان کر دیا کہ قرآن مخلوق ہے اس کا قدیم کہنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

طبری نے اس کا آغاز ۲۱۲ھ میں بتایا ہے۔

فیہا اظہر المامون القول بخلق القراٰن

اس سال مامون نے قرآن کے مخلوق ہونے کا قول ظاہر کیا۔

سطحی نظر رکھنے والے ارباب ظاہر اور محدثین یقیناً اس سے متفق نہیں ہو سکتے تھے اُنہوں نے سخت اختلاف کیا یہاں تک کہ شورش پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ لہٰذا مامون نے چند سال تک کے لئے اس مسئلہ میں سکوت اختیار کیا۔

کاش یہ بحث صرف علمی وتحقیقی دائرہ میں محدود رہتی مگر کیا کیا جائے کہ عام تشدد آمیز ذہنیت کے علماء ومحدثین نے اس بحث کو اسلام اور کفر کا سوال بنا لیا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' کے حصہ اول میں اس تشدد آمیز ذہنیت پر کافی افسوس کیا ہے۔ ہم اس اختلاف اور محدثین کے متشدانہ اقوال کے نمونے ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

مسائل اختلافیہ میں ایک یہ بھی تھا کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟ معتزلہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی جو خدا کی صفات قدیمہ میں سے ہے وہ قدیم ہے ا۔ لیکن جو الفاظ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق اور حادث تھے۔ محدثین کہتے تھے کہ کلام الٰہی ہر حال میں قدیم ہے۔ زیادہ تدقیق سے دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن دونوں فرقہ نے اس مسئلہ کو کفر واسلام کی حد فاصل قرار دیا۔

امام بیہقی نے کتاب ''الاسما الصفات'' میں اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے ہم اس کی سند سے اس موقع پر چند بڑے بڑے محدثین کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

وکیع بن الجراح:

مَن زعم ان القراٰن محدث فقد کفر۔ جس شخص کا یہ خیال ہے کہ قرآن حادث ہے وہ کافر ہے

یزیدبن ہرون:

مَن زعم ان کلام اللہ مخلوق فھو والذی لاَ اِلٰہ اِلاَّ ھو عندی زندیق

جوشخص کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے وہ خدا کی قسم زندیق ہے

مزنی شاگردشافعی:

مَن قال انّ القراٰن مخلوق فھو کافر جوشخص کہتا ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے

امام بخاری:

نظرت فی کلام الیھود والنصاریٰ والمجوس فمارایت قوما اضل فی کفرھم من الجھمیۃ وانی لا ستجھل من لا یکفرھم میں نے یہودیوں،عیسائیوں اور مجوسیوں سب کے کلام دیکھے ہیں جہمیہ کے برابر کوئی ان میں سے کافر،جہل نہیں میں اس کو جاہل سمجھتا ہوں جو جہمیہ کو کافر نہ سمجھے۔

عبدالرحمٰن بن مہدی:

لورایت رجلا علی الجسر و بیدی سیف یقول القراٰن مخلوق ضربت عنقہ

اگر میرے ہاتھ میں تلوار ہو اور کسی کو پل پر یہ کہتے سن لوں کہ قرآن مخلوق ہے تو اس کی گردن ماردوں

بعض محدثوں نے جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں اس مسئلہ میں یہ تفریق کی تھی کہ قرآن مجید کا جو تلفظ کیا جاتا ہے۔ یہ مخلوق ہے اور حادث ہے لیکن محدثین نے اس کی بھی سخت مخالفت کی۔ ذہلی، امام بخاری کے استاد تھے اور صحیح بخاری میں بہت سی حدیثیں ان کی روایت سے مذکور ہیں۔ انہوں نے امام بخاری کا جب یہ قول سنا تو عام حکم دے دیا کہ جو شخص یہ لفظ کہے کہ ''لفظی بالقرآن مخلوق'' وہ ہماری مجلس میں نہ آنے پائے۔ چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے شرح بخاری میں نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ابن شداد نے ایک تحریر میں لکھا تھا کہ ''لفظی بالقرآن مخلوق'' یہ تحریر امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش ہوئی تو انہوں نے اس فقرہ کو کاٹ دیا اور کہا کہ قرآن جس صورت میں ہو غیر مخلوق ہے۔

ابوطالب نے کہا تھا کہ امام احمد بن حنبل قرآن کے تلفظ کو مخلوق کہتے ہیں۔ امام بن حنبل کو خبر ہوئی تو غصہ سے کانپنے لگے اور ابوطالب کو بلا کر اس بات کی باز پرس کی۔ (علم الکلام حصہ مطبوعہ انوار المطابع ص ۱۷)

غالباً اسی متشددانہ رویہ کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید کو اس مسئلہ میں کد ہوگئی ایک تو بادشاہوں کا دماغی توازن ہر بات میں اعتدال کے حدود پر قائم نہیں رہتا، وہ جس بات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور انہماک ان کا افراط کے درجہ پر پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے عموماً افراد انسانی کی ذہنیت کہ جس بات میں ان کی زیادہ مخالفت ہو، اس میں ان کو زیادہ کاوش اور ردعمل کی کوشش پیدا ہوتی ہے۔

اس کا نتیجہ تھا کہ مامون الرشید نے عارضی طور سے چند سال کے لئے سکوت اختیار کر کے ایک مرتبہ اپنے عقیدہ خلق قرآن کی حمایت میں جہاد کی ٹھان لی۔ اور اسحاق بن ابراہیم خزائی کو جو بغداد میں گورنر کی حیثیت سے تھا، ایک مبسوط خط کے ذریعہ سے حکم دیا کہ وہ تمام علمائے وقت کو جمع کر کے خلق قرآن کے مسئلہ میں ان کے خیالات دریافت

کرے اور جو اس کے منکر ہوں انہیں سخت سے سخت سزا کا حکم دیا جائے۔

طبری نے ۲۱۸ھ کے واقعات میں اس تاریخی یادگار خط کو نقل کیا جس کے اہم اجزاء کا مضمون جس میں خلق قرآن کے علمی دلائل بھی درج کئے گئے ہیں حسب ذیل ہے۔ ''اینجانب کو معلوم ہوا ہے کہ سواد اعظم اور جمہور افراد عوام اور پست طبقہ کی رعیت میں سے جن کو قوت نظر اور طاقت استدلال نہیں ہے اور نور علم سے بہرہ مند نہیں ہوئے ہیں۔تمام اطراف ملک میں بالکل خدا کے مرتب سے ناواقف اور دین خدا کی حقیقت اور اس کی توحید اور ایمان سے کورچشمی و گمراہی میں مبتلا اور اس کے روشن نشانوں اور واجبی راستے سے منحرف اور اس بات سے قاصر ہیں کہ وہ اللہ کو اس کی شان کے مطابق اوصاف کے ساتھ خیال کریں اور اس کی حقیقت معرفت کو حاصل کریں اور اس میں اور اس کے مخلوق میں فرق سمجھ سکیں۔اس لئے کہ ان کے افکار کمزور ان کی عقلیں ناقص اور وہ غور وفکر اور یادداشت میں کمزور ہیں۔

انہوں نے مساوات قرار دے دی اللہ اور اس کے نازل کردہ قرآن میں اور وہ سب کے سب متفق ہو گئے اور اس پر کہ یہ قدیم وازلی ہے اور اللہ کی مخلوق نہیں ہے حالانکہ خداوند عالم کتاب محکم میں ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا.

ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن۔(زخرف۔۳)

ظاہر ہے کہ جو چیز خدا نے بنائی ہو وہ اس کی پیدا کی ہوئی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ ٱلَّذِى خَلَقَ ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضَ وَجَعَلَ ٱلظُّلُمَٰتِ وَٱلنُّورَ

حمد ہے اس اللہ کے لئے جس نے خلق کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں و روشنی کو (انعام۔۱)

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا: كَذَٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ

اس طرح ہم تم سے واقعات بیان کرتے ہیں اس دور کے جو پہلے گزر گیا۔(طٰہٰ۔۹۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بعد یہ کلام وجود میں آیا ہے

نیز ارشاد کیا: الٓر ۚ كِتَٰبٌ أُحْكِمَتْ ءَايَٰتُهُۥ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ①

یہ کتاب وہ ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں اور پھر حکیم خبیر (خدا) کی طرف سے اس کی تفصیل کی گئی ہے۔(سورۂ ہود۔۱)

جو شے محکم شدہ اور تفصیل کی ہوئی ہو اس کے لئے کوئی محکم بنانے والا اور تفصیل کرنے والا ہوگا۔وہی اس کا خالق اور موجد قرار پائے گا۔

پھر انہی لوگوں نے غلط بات پر بحث شروع کر دی اور وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہی اہل حق اہل سنت اور اہل جماعت ہیں اور ان کے سوا جتنے ہیں، سب اہل باطل کافر اور تفرقہ پرداز ہیں۔اس طرح انہوں نے عوام میں ہنگامہ برپا کر دیا۔۔۔تمہیں چاہیے کہ جتنے قاضی تمہارے یہاں ہوں سب کو جمع کرو اور ان کے سامنے ہمارے خط کو پڑھ کر سناؤ اور خلق و حدوث قرآن کے متعلق ان کے خیالات دریافت کرو اور یہ واضح کر دو کہ خلیفۃ المسلمین اپنی حکومت میں کوئی منصب ایسے شخص کو سپرد کرنا مناسب

نہیں سمجھتے جس کے دین اور خالص توحید پر انہیں بھروسہ نہ ہو۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں اور خلیفہ کی رائے سے متفق اور ہدایت ونجات کے راستے کے سالک ہوں تو انہیں حکم دو کہ وہ اس مسئلہ کو ان تمام شواہد و دلائل کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کریں اور ان سے ان کے عقیدہ کے متعلق دریافت کریں جو قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار نہ کرے، اس کی گواہی قبول نہ کی جائے۔ اس کے بعد ان تمام قاضیوں کی کارگزاری کی رپورٹ تمہیں میرے پاس بھیجنا ہوگی اور اس کے بعد ان کی نگرانی کرتے رہنا کہ وہ اس پر برقرار ہیں یا نہیں اور برابر ان حالات کی تفصیلی اطلاع میرے پاس بھیجتے رہو۔'' آخر میں مراسلہ کی تاریخ۔ ربیع الاوّل ۲۱۸ھ

چوں کہ مامون الرشید بادشاہ ہونے کے ساتھ ایسا تھا کہ حافظ سیوطی لکھتے ہیں:

کان یعد من کبار العلماء اس کا شمار بڑے علماء میں ہوتا ہے

اس لئے وہ علماء کے متشدانہ فتوائے کفر کے سامنے سپر انداختہ ہونے کے بجائے خود قوت استدلال کے ساتھ اپنے حریفوں کو کافر ثابت کرنے کے درپے ہوا اور ملوکانہ اقتدار کے ساتھ انہیں کافر کی پاداش دینے پر بھی تیار ہوگیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ اس کے بعد سوا امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح عجل کے باقی جتنے فقہاء ومحدثین تھے سب نے خلق قرآن کے عقیدہ کا اعلان کردیا۔ سیوطی کے الفاظ یہ ہیں کہ:

اِنَّهُمْ تَوَقَّفُوْا اَوَّلاً ثُمَّ اَجَابُوْا تَقِيَّةً

ان لوگوں نے پہلے کچھ تامّل سے کام لیا پھر تقیہ کے طور پر موافقت ظاہر کی

ان تقیہ کرنے والوں میں یحییٰ بن معیّن ایسے حفاظ وائمہ فن حدیث تھے۔ حافظ یحییٰ بن معیّن فرماتے تھے کہ: **اجبنا خوفا من السیف**: ہم نے تلوار کے ڈر سے موافقت کی بعض علماء نے جنہیں موقع ملا ترک وطن کیا۔ چناں چہ حافظ احمد بن عبداللہ بن

صالح ابوالحسن عجلی کوفی متوفی ۲۶۱ھ کے حال میں ہے:

خرج الی المغرب ایّام فتنة القراٰن و سکن طرابلس الغرب

یہ خلق قرآن والے ہنگامہ میں مغرب کی طرف نکل گئے اور طرابلس مغربی میں قیام کیا۔ (ہدایت العارفین جلد نمبر ۱ کالم ۴۹)

کچھ عرصہ کے بعد مامون کی مدت حیات ختم ہوگئی اور اس کے بعد کے سلاطین رائے عامہ کے پیرو ہوگئے اس طرح یہ ہنگامہ ختم ہوا پھر بھی کچھ عرصہ تک مصنفین اس موضوع پر قلم فرسائی کرتے رہے۔ چنانچہ ابن ندیم نے اس سلسلہ کی ایک کتاب کا حوالہ دیا ہے: الفہرست کے صفحہ ۶۳ کتاب خلق القرآن، الابن الرواندیہ بعد میں اہلسنت میں قرآن کا قدیم اور غیر مخلوق ہونا بالکل مسلمات میں سے ہوگیا لیکن شیعی نقطہ نظر بالاتفاق اس کے خلاف رہا جس پر عملی حیثیت سے سابق میں روشنی ڈالی جاچکی ہے۔

تیسرا تبصرہ
نزول قرآن کی تاریخ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تدریجی حیثیت سے موقع ومحل کے اقتضا سے نازل ہوتا تھا اور اسی اعتبار سے اس میں ماضی، مستقبل اور حال کے واقعات کی تفریق ہوئی ہے یعنی پہلے ہو چکنے والے واقعات ماضی کے الفاظ سے اور بعد میں ہونے والے مستقبل کی حیثیت میں اور موجودہ حالات کا تذکرہ حال کی صورت میں کیا گیا ہے۔ وہ روز وقوع واقعہ آنے والی آیت میں (الیوم) یعنی (آج) کی لفظ اور آئندہ کے تذکرہ میں حرف سین (س) اور لفظ سَوۡفَ کے ساتھ قریب اور بعید کے حدود قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کے نزول کی کوئی ایک تاریخ مقررہ کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ تیئیس برس کے عرصہ میں جستہ جستہ اترا ہے۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں نزول قرآن کی تاریخ کا ذکر ملتا ہے۔

ایک طرف یہ ارشاد کہ شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰن۔ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''۔ اس میں قرآن مجید اتارنے جانے کو گیارہ مہینوں سے ہٹا کر ایک مہینہ میں محدود کیا گیا۔ دوسری طرف ارشاد ہوا:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ

ہم نے اس کو ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔ (سورہ دخان۔ ۳)

اس سے پتہ چلا کہ یہ تنزیل کسی خاص رات میں ہوئی ہے اور اب دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ماہ رمضان کی کوئی ایک رات ہے اور پھر ایک پورا سورہ

''سورۂ قدر'' اس میں انضباط مکمل طریقہ سے کیا گیا کہ:

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰهُ فِیۡ لَیۡلَةِ الۡقَدۡرِ

ہم نے اس کو شب قدر میں اتارا ہے

اب ان تینوں آیتوں سے یہ تعین ہوا کہ نزول قرآن شب قدر میں ہوا ہے اور وہ ماہ رمضان کی ایک رات ہے۔

اب وہ کہ جو قرآن کو قدیم اور بطور کلامِ نفسی کے ازل سے ذات الٰہی میں ثابت سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ الفاظ جو کاشف اور حاکی ہیں کلام حق کے، وہ تو کسی ایک وقت پر نازل نہیں ہوئے بتدریج اترے۔ لہٰذا ان کی یہ تاریخ ہو نہیں سکتی اور قدیم چیز قدیم ہے اس کی کوئی ابتداء نہیں پھر اس کیلئے تاریخ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

لیکن ہم کہ جو قرآن کو حضرت احدیّت کا مخلوق جانتے اور اسی حیثیت سے اس کو کلام الٰہی مانتے ہیں ان آیات کی بتائی ہوئی تاریخ کو اسی انشاء وخلق قرآن سے متعلق سمجھتے ہیں جو عالم ملاء اعلیٰ میں صورت پذیر ہوا یا تنزیل کی لفظ کے لحاظ سے مراد ''تنزیل اول'' ہے جو لوح محفوظ سے ''بیت معمور'' کی طرف ہوئی، جس کا حدیث معصوم میں ذکر ہے ([1])۔

اور پہلے بیان ہو چکا کہ وہاں کے اشیاء ہمارے اس عالم سے تعلق نہیں رکھتے جہاں کے واقعات ہمارے ''فن تاریخ'' کا موضوع بحث بن سکتے ہیں۔

---

[1] ۔سئل الصادق فقال انزل جملة و حدة شهر رمضان الى البيت المعمور ثم نزل من البيت المعمور الى النبى صلى الله عليه واله فى طول عشرين سنة (تفسير على بن ابراهيم قمى)

چوتھا تبصرہ

اعجاز قرآن

معجزہ کے معنی

معجزہ وہ غیر معمولی چیز ہے جو کسی نبی کو دعوائے نبوت یا کسی اور الٰہی منصب والے کو اس کے منصب کے ثبوت میں خداوند عالم کی جانب سے عطا ہو، جس کے مقابل لانے سے اس کے حدود منصب کے تحت والی دنیا کی تمام طاقتیں عاجز ہوں۔

بعض لوگ اسے مادی حیثیت میں محدود سمجھ لیتے ہیں۔ جیسے: ماہتاب کا شق ہونا آفتاب کا پلٹنا سنگریزوں کا تسبیح کرنا اور ایسی ہی باتیں جو ہوں وہی ان کے نزدیک معجزہ کہلاتی ہیں۔

اس لئے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو لوگ اپنے عقول کے اعتبار سے اتنے ترقی یافتہ ہوں کہ وہ حقائق پر غور کر سکیں، ان کے لئے ان مادی مظاہرات کی کیا ضرورت؟

یہ خیال اول تو اس لئے غلط ہے کہ صاحبان منصب ہدایت صرف ایسے ترقی یافتہ افراد کے لئے نہیں آتے بلکہ ان کے دائرہ عمل میں خواص کے ساتھ عوام بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا معیار ذہن کے لحاظ سے ان کے پاس دلائل حقانیت ہونا چاہئیں۔ دوسرے یہ کہ معجزہ نام صرف ان مادی مظاہرات کا نہیں ہے بلکہ معجزہ ان غیر معمولی آثار کا نام ہے جو ایک مدعی نبوت میں اس کے دعویٰ کی خصوصی دلیل بن سکیں خواہ وہ ازقبیل افعال ہوں جیسے کورِ مادرزاد اور برص وجذام کے مبتلا کو صحت دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور مٹی سے پرند کی صورت بنا کر اس میں پھونک مار کر سچ مچ کا طائر بنا دینا۔ یہ معجزات جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا

ہوئے اور عصا کا دریا پر مارنا جس سے دریا میں راستے بن جائیں اور پتھر پر مارنا کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلیں اور عصا کو اژدہا بنا دینا جو حضرت موسیٰؑ کے معجزے ہیں یا ازقبیل کلام جیسے: قرآن مجید جو ہمارے رسولؐ کا معجزہ ہے یا ازقبیل صفت، جیسے ہمارے رسولؐ کے بہت سے خصوصیات جسم اقدس کا سایہ مفقود ہونا، غیر معمولی خوشبو، پس پشت کی چیز کا اس طرح دکھائی دینا جیسے سامنے کی چیز اور ایسی بہت سی باتیں یا اس شخص کے تعلق سے غیر معمولی حالات کا پیدا ہونا، جیسے: قوم فرعون پر جوؤں، مینڈکوں اور خون وغیرہ کے عذاب کا آنا جس کا تذکرہ قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ ہے۔ یہ تمام باتیں معجزات میں داخل ہیں اس طرح خواص وعوام کی سطح ذہن کے لحاظ سے معجزات مختلف ہو سکتے ہیں ایک بلند مرتبہ فلاسفر کے لئے وہ رموز واسرار عقلی معجزہ ہوں گے جو اس کے کلام میں ودیعت ہیں لیکن سطحی نظر رکھنے والے انسانوں کے لئے جو حقائق کلام کی رفعتوں کو نہیں سمجھ سکتے وہی مادی مظاہرات معجزہ قرار پائیں گے۔

معجزہ کی ضرورت:

انسانی افراد اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے اقتدار پسندی و جاہ طلبی کے پتلے ہوا و ہوس کے مجسمے اور ذاتی ونفسانی اغراض کے بندے ہوتے ہیں۔ انہیں کسی ایسی بات کا دعویٰ جس میں اپنی سیادت تسلیم ہوتی، اپنی بات بالا ہوتی اور دوسرے بہت سے سادہ لوح افراد کے دلوں پر ان کی حکومت کا سکہ قائم ہوتا ہو بہت خوشگوار معلوم ہوتا ہے ان کو اس میں کسی واقعیت کا لحاظ پس وپیش کرنے پر آمادہ نہیں کرتا بلکہ ایک وقتی شان وشوکت ان کو بڑے سے بڑے غلط دعویٰ پر آمادہ کر سکتی ہے جس کی آخری حد خدائی کے دعوائے باطل تک پہونچتی ہے۔ اس کے آگے کوئی زینہ ہی نہیں کہ قدمِ ادّعاء، وہاں تک پہنچے۔

نبوت اور رسالت اور ایسے ہی کسی خدائی منصب کا بلاشبہ روحانی اقتدار سیادت

اورحق فرماں روائی کے ساتھ لازم وملزوم کا رشتہ ہے بلکہ ایک پیشوائے دین کا اپنے ماننے والوں پر اقتدار اس سے زیادہ ہوتا ہے جتنا ایک بادشاہ کا اپنی رعایا پر اس لئے کہ بادشاہ کے سامنے سر جھکتے ہیں اور پیشوا کے لئے دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا عام انسانی افراد کے اقتدار پسند طبائع اس جامہ کو زیب تن کرنے اور اس منصب کے غلط دعوایدار ہونے پر بڑی جرات کے ساتھ آمادہ ہوجاتے ہیں۔

اس میں آسانی یوں محسوس ہوتی ہے کہ دنیاوی مناصب ظاہری اسباب اور مادی ساز وسامان سے وابستہ ہوتے ہیں تو وہ سامان جس کے پاس نہ ہوں اس کے لئے ان مناصب کے دعوے کے کوئی معنی نہیں ایک بے تاج وتخت، بے مال ودولت، زاویہ نشین فقیر یہ دعوی کرے کہ میں بادشاہ یا وزیر ہوں یا رکن سلطنت ہوں تو لوگ اسے دیوانہ سمجھ کر ذریعہ تفریح بنالیں گے۔ کوئی اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر آمادہ کہاں ہوگا لیکن نبوت ورسالت وغیرہ، یہ مناصب کسی ظاہری ساز وسامان سے وابستہ نہیں ہوتے بلکہ وہ روحانی پیغام اور وحی والہام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں تو کسی کو ان کے ادعاء میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ انسانی لوازم زندگی کے اعتبار سے انبیاء ومرسلین بھی عام افراد بشری کی طرح ہوتے ہیں بے شک ان کا ذاتی جو ہر ایسا بلند ہوتا ہے کہ قدرت کی طرف سے وہ بلند منصب کے لئے منتخب کئے جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ عامۃ الخلائق خدا تک جانہیں سکتے کہ خود اس سے پوچھ لیں کہ اس نے اس شخص کو اپنے منصب کے لئے مقرر کیا ہے یا نہیں، تو اب اس دعویٰ کر لینے میں دشواری ہے کہ مجھ کو خدا نے اس عہدے کے لئے منتخب کیا ہے اور تمام خلق کی رہنمائی کے لئے قرار دیا ہے چنانچہ ہر قوم کے نزدیک متفقہ طور پر بعض ایسے لوگ ہیں جنھوں نے غلط طریقہ پر نبوت کا دعویٰ کیا اور کسی باطل مذہب کی بنیاد قائم کی۔

ایک قانون کا مرتب کر لینا اور دنیا کی رفتار پر نظر کر کے کچھ اصول قرار دے

لینا جن کو ''شریعت الٰہیہ'' کے نام سے پیش کیا جائے، کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

یہ فیصلہ کہ اس کے تمام احکام صحیح اصول پر مبنی ہیں یا نہیں؟ عام افراد کے حدودِ دسترس سے باہر ہے۔ اس لئے کہ انسانی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں عقلائے زمانہ کے خیالات ایک نقطہ پر متفق نہیں چہ جائے کہ عام افراد۔

اب اگر اس مدعی نبوت وغیرہ کے پاس جو حقیقۃً خدا کا فرستادہ اور اس کی طرف کے منصب کا حامل ہے صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہو کہ میں خدا کی طرف سے مقرر ہوا ہوں اور اس دعویٰ کی تصدیق کے لئے کوئی ثبوت نہ ہو تو اس میں اور ان لوگوں میں جو غلط طور پر یہی دعویٰ کر رہے ہیں فرق ہی کیا رہا اور عام افراد پر کیوں کر یہ فرض عائد کیا جائے کہ وہ اس سچے نبی کے قول کو تسلیم کریں، اس کے دعویٰ کو سر آنکھوں پر رکھیں اور اس کی اطاعت کریں اور دوسروں کے دعوے سے انکار کریں اور ان کی شریعت کو تسلیم نہ کریں۔

اس کے لئے عقل ضروری سمجھتی ہے کہ یقیناً وہ شخص جو خدائے حکیم وخبیر کا حقیقی نمائندہ ہے، اس کے لئے خدا کی جانب سے خصوصی طور پر ایسی کوئی بات ہونا چاہئے جیسے وہ بحیثیت دلیل دعوئے نبوت پیش کرے اور جس کے مقابلے میں دنیا کی طاقتیں عاجز ہوں ورنہ ان دیکھا خدا جو بغیر اپنے آثار قدرت کے نہ پہنچانا جا سکا اس کے سفیر کو ہم بغیر آثار کے کیوں کر پہچانیں۔

اب وہ آثار جو کسی ذات کی معرفت پیدا کر سکتے ہیں، کیسے ہونے چاہئیں، اگر وہ آثار اس کے اور اس کے غیر میں مشترک ہیں تو وہ خصوصی طور پر اس کا تعارف کیوں کر سکتے ہیں تو ضرورت ہے کہ آثار ایسے ہوں جو اس ذات سے مخصوص ہیں۔ وہ ذریعہ معرفت بن سکتے ہیں تو جس طرح خدا کے وجود کی دلیل وہی آثار بن سکتے ہیں جن پر خدا کے سوا کوئی قادر نہ ہو تو اس کی طرف کے عطا کردہ منصب کا ثبوت بھی ایسی ہی نشانیوں سے ہوسکتا ہے جو اس کی طرف صاحب منصب سے مخصوص ہوں۔ مخصوص ہونے ہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی دوسرا اس کے

مثل پیش کرنے پر قادر نہ ہو۔ اسی کو کہتے ہیں "**معجزہ**"

معجزہ اور اثبات حقانیت

یہ امر ایک حد تک محل بحث رہا ہے کہ معجزہ سے کسی نبی کی سچائی پر کیوں کر روشنی پڑتی ہے؟

بہت سے لوگ معجزہ کی حقیقت کو صرف ایک غیر معمولی عجیب اور غریب کرتب میں منحصر سمجھ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ایسی باتیں تو اکثر جادوگر، شعبدہ باز بھی پیش کر دیتے ہیں یا بعض غیر معمولی طاقت کے انسان اکثر ایسے کام کرتے ہیں جن سے عام افراد قاصر نظر آتے ہیں تو کیا ان میں سے ہر ایک معجزہ سمجھا جائے گا، اور اگر نہیں تو اس میں اور معجزات انبیاء میں کیا فرق ہے؟

یہ سوال حقیقتاً دلیل اعجاز کے متعلق ناسمجھی پر مبنی ہے۔

اعجاز کی بنیاد ایک باریک خصوصیت پر ہے جس کی وجہ سے ایک قسم کا عجیب و غریب مظاہرہ ایک مدعی نبوت کے لئے دلیل اعجاز اور سبب ثبوت نبوت ہوتا ہے اور اسی قسم کا مظاہرہ ایک ساحر اور جادوگر کا یا کسی غیر معمولی انسان کا کوئی مخصوص کمال اس کا معجزہ نہیں ہوتا اور دلیل نبوت قرار نہیں پاتا۔

غور سے ملاحظہ ہو۔ حضرت حق عز اسمہ حکیم علی الاطلاق نقص وعیب سے بری اور ظلم و دروغ باطل کی حمایت سے بلند و برتر ہے اس کے دامن حکمت پر کسی باطل پروری اور ناحق کوشی کی حمایت کا دھبہ نہیں پڑ سکتا۔

ہمارے ایسے عام افراد میں کوئی ہماری جانب سے ایک غلط بات کی اشاعت کرے، ہمارا نام لے کر کسی غلط امر کا ادعا کرے اور ہماری طرف سے کوئی شناخت ثبوت میں پیش بھی کرے جس سے عام اشخاص کا دھوکا کھا جانا اصول فطرت کے لحاظ سے حق

بجانب ہو تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حقیقت کا اظہار اور واقعیت کا اعلان کر دیں اور اپنی ذمہ داری کو اس سلسلہ میں پورا کریں۔

ایک گندم نما جو فروش، ریا کار و ظاہر دار، زہد و تقوٰی کا بیوپاری اور بناوٹی ورع و تقوٰی کا دوکاندار میری طرف سے اجازہ اجتہاد یا پیش نمازی میرے جعلی دستخط اور مہر سے بنا کر اطراف و جوانب، شہر و دیہات میں جا تا خلق خدا کی گمراہی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس صورت میں لوگوں کا تو یہ فرض ہے کہ جب وہ میری طرف نسبت دے کر اپنی اشتہاری پیش نمازی یا اجتہاد کی دعوت دے تو وہ اس سے دلیل اور سند کا مطالبہ کریں لیکن جب اس نے اس مطالبہ کے جواب میں دستخطی و مہری سند پیش کر دی تو عوام کا فرض ختم ہو چکا۔ اب اگر مجھے اس کی اطلاع ہو تو میرا لازمی فریضہ یہ ہے کہ میں اس کا اعلان کر دوں کہ یہ میرے دستخط اور مہر نہیں ہیں میری طرف ان کی نسبت غلط ہے اور اگر میں سکوت کرتا ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے میں اس کے دعوٰی کی تصدیق کرتا اور عملی حیثیت سے اس کی تائید کرتا ہوں۔

اب میرا یہاں تو یہ ممکن ہے کہ میں باوجود اس فریضہ کے عاید ہونے کے اپنے فرض کو محسوس نہ کروں یا احساس ہونے کے باوجود کسی روپہلی، سنہری مصلحت کی وجہ سے اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے حمایت باطل اور گمراہی خلق کی ذمہ داری اپنے سر لے لوں لیکن خداوند عالم کے یہاں تو یہ ممکن نہیں ہے۔

جب خدا کی طرف سے ایک شخص نے کسی منصب کا دعوٰی کیا جو رہنمائی اور پیشوائی خلق کی نوعیت رکھتا ہے۔ مثلاً اس نے اظہار کیا کہ مجھے خدا نے نبوت و رسالت کے شرف سے ممتاز کیا اور سفارت کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز کیا تو عامہ خلائق کا فرض ہے کہ وہ اس سے دلیل کا مطالبہ کریں اور ثبوت نبوت کے لئے ایسی کسی خاص بات کے پیش کرنے کی خواہش کریں جس سے دوسرے قاصر ہیں۔ اب اگر اس نے عام انسانوں کے طاقت و

اقتدار کے حدود سے بالاتر اور عام بشری دائرہ قدرت سے باہر کوئی ایسا امر پیش کر دیا جس سے انسانی کمال کا ہاتھ کوتاہ نظر آیا۔ اس نے کہا کہ یہ طاقت مجھے خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے اور یہ میری سچائی کا ثبوت ہے

اس کے بعد اگر خدا ہمارا ایسا شخص ہوتا جس پر بے خبری اور سہو ونسیان وغیرہ کا امکان ہوتا تو ممکن ہے عرصہ تک اس کی خاموشی بے خبری کے سبب سے حق بجانب قرار پاسکتی، لیکن عالم وحکیم خدا، حاضر وناظر خدا اور نظام کائنات کا مدبر خدا اگر اس کے بعد خاموش رہا یعنی اس کے دعویٰ کو برقرار رہنے دیا۔ اس طرح کہ نہ اس کے ادعائے بے مثالی کو توڑنے کے لئے خود اس کی طاقت سلب کی اور نہ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کو طاقت عطا کی تو سمجھنا پڑے گا کہ اس نے اس کی نمائندگی کا امضا، سفارت کا اقرار اور عہدہ کی تائید اور اس کے دعوائے نبوت ورسالت وغیرہ کی عملی طور پر تصدیق کر دی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ سچا صاحب منصب ہے اگر ایسا نہیں تو اللہ پر حمایت باطل گمراہی خلق اور پامالی حق کا الزام آتا ہے جو کسی طرح اس کی شان جلال وکمال کے لئے جائز نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معجزہ میں جو روح اعجاز دوڑتی ہے وہ اس روحانی پیشوائی کے دعویٰ کی بناء پر ہے جو اس قدرت نمائی کا انتساب خدا کی طرف کر دیتا ہے اور جس کے بعد خالق پر ذمہ داری عاید ہو جاتی ہے لیکن اگر کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے تو لاکھ کوئی عجائبات پیش کرے اور حیرت انگیز کام انجام دے ہر موقع پر اللہ کا یہ فرض تھوڑی ہے کہ ہر بات کے مقابلہ میں ایک بات اور ہر چیز کے جواب میں ایک چیز پیش کرتا رہے۔ آخر اس صورت میں یہ سلسلہ کہیں پر ختم بھی تو ہوگا وہ آخری چیز لاجواب ہی ہوگی کیوں کہ اس کی کوئی مثال موجود نہ ہوگی۔

ان عجیب مظاہروں، حیرت انگیز کرتبوں اور تعجب خیز کارگزاریوں سے جب

خدا پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی تو ان عجیب کارناموں کا برقرار رہنا کسی خاص حقیقت کی دلیل قرار نہیں پاتا۔

مذکورہ بالا بیان کی بناء پر معجزہ کی بنیاد حسب ذیل ارکان پر ہے جن کے بغیر کوئی چیز معجزہ سمجھی نہیں جاسکتی۔

(۱) منصب روحانی مثلاً نبوت کا ادعا۔

(۲) غیر معمولی امر ہونا جو اس حلقہ میں کہ جو دعوائے منصب کا مخاطب ہے تمام افراد کے دائرہ اقتدار سے باہر ہو اس لئے کہ اگر ایسا امر ہوا جس پر دوسرے اشخاص بھی قدرت رکھتے ہیں تو وہ کسی مرتبہ وعہدہ کی دلیل نہیں بن سکتا۔

(۳) اس دعویٰ کے بعد کسی ایسے شخص کا پیدا نہ ہونا جو اس دعویٰ کو توڑ کر اسے باطل کر سکے۔

(۴) حالات اور خصوصیات کی بناء پر کسی ایسے امر کا موجود نہ ہونا جو اس مدعی نبوت کے دعویٰ کا قطعی بطلان کرنے کے لئے کافی ہو۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہوا یعنی کوئی ایسا امر پایا گیا جو اس کے دعویٰ کو باطل ثابت کرنے کے لئے کافی ہے جیسے مستند تسلیم شدہ نبی سابق کا اعلان کہ میرے بعد آنے والا مدعی نبوت غلط گو ہوگا یا یہ اعلان کہ میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، یا خود اس شخص کا جو مدعی منصب ہے فاسق وفاجر اور اپنی سابقہ زندگی کے لحاظ سے بالکل ناکارہ ہونا جس کے ساتھ اس کا بعہدہ نبوت وغیرہ منتخب ہونا قطعی دلائل عقلیہ اور خداوند عالم کے مواعید یقینیہ کے خلاف ہے تو ایسے شخص کا مدعی ہونے کے ساتھ کسی غیر معمولی امر کا اظہار بھی اس کی نبوت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے اس لئے کہ ثبوت تو خداوند عالم پر ذمہ داری عاید ہونے کی بنیاد پر تھا اور یہاں اس کی ذمہ داری نبی سابق کے اعلان یا ان قطعی دلائل سے جو ایسے شخص کی نبوت کے منافی ہیں پوری ہو چکی ہے، جو خدا کی طرف سے حجت تمام ہونے اور خلق کو گمراہی سے محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ لہٰذا اب خداوند عالم کو اس مدعی نبوت کے

دعویٰ کو خصوصی طور پر کسی طریقہ سے باطل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

معجزہ کا سحر اور غیر معمولی انسانی کمالات سے تفرقہ

معجزہ کے ارکان میں سے پہلا اور تیسرا رکن وہ ہے جو معجزہ کو سحر اور جادو سے الگ کر دیتا ہے یقیناً جادو میں بھی ایک حیرت انگیز صورت کا مظاہرہ ہوتا ہے لیکن یا تو اس کے ساتھ دعوائے نبوت وغیرہ ہوتا نہیں اس لئے خداوند عالم پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی یا اگر دعوئے نبوت ورسالت کے ساتھ یا کسی سچے نبی کے دعوئے نبوت اور معجزہ کے مقابلہ میں ہوتو اللہ اس کے ابطال کا سامان کر دیتا ہے جیسا کہ ساحران فرعون کے قصہ میں واقع ہوا۔ بہت سے وہ اشخاص جنہوں نے حقیقت معجزہ اور دلیل اعجاز پر غور نہیں کیا ہے، اعجاز نبوت کے مقابلہ میں بہت سے اشخاص کے ذاتی کمالات کو پیش کر دیتے ہیں۔

مثلاً یہ کہتے ہیں کہ قرآن بحیثیت فصاحت وبلاغت اگر اس لئے معجزہ ہے کہ اس کا مثل کوئی نہیں لا سکا، تو بہت سے علمی وادبی آثار مختلف ادباء کے مختلف زبانوں میں ایسے ہیں جن کا مثل ونظیر اب تک باوجود کوشش وکاوش کے وجود میں نہیں آ سکا، جیسے شاہنامہؔ فردوسی اور گلستان سعدیؔ، اردو میں مثنوی میر حسن اور مراثی میر انیسؔ انگریزی میں شکسپیر وغیرہ کے آثار قلمی اور ادبی کارنامے اس کا جواب ہمارے مذکورہ بالا بیانات سے ظاہر ہے۔ اول تو مذکورہ بالا مظاہرات کا موقع ظہور اس وقت ہے کہ جب ختم نبوت کے اعلان اور ائمہ دین کے نام بنام متعین نے کسی مدعی منصب الٰہی کے لئے دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس لئے چوتھے رکن کی بناء پر دلیل اعجاز مکمل نہیں ہے اور ان مظاہرات سے حقیقت اعجاز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

پھر یہ کہ فردوسیؔ، سعدیؔ، میر حسنؔ، میر انیسؔ اوور شکسپیر وغیرہ کے کارناموں کے ساتھ کوئی دعویٰ ایسا وابستہ نہیں ہے جس کے ابطال کی اللہ کی ضرورت ہو۔

دنیا میں مختلف طرح کے کلام ہوتے ہیں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی، اللہ کو کیا لازم ہے کہ وہ ہمیشہ ان کاموں میں ناکامی پیدا کرتا رہے آخر یہ دل دماغ بھی تو اسی کے خلق کردہ ہیں جن سے یہ غیر معمولی کارنامے ہو رہے ہیں پھر وہ اپنی پیدا کی ہوئی صلاحیتوں کے جوہروں کو روبکار آنے سے کس لئے مانع ہو؟

سحر بھی عالم اسباب کے ماتحت ہے۔ دنیا میں جتنے اسباب کارفرما ہیں سب اللہ کے خلق کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعض اسباب سے کوئی خاص کام لینے میں عام حالات میں اس نے روکا ہو۔ چناں چہ سحر ایسی ہی چیز ہے جو ممنوع قرار دی گئی ہے لیکن اسے بے اثر بنانا ہر حال میں اللہ کو لازم ہو، اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ غیر معمولی چیز یا خارق عادت تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اس عام دستور کیخلاف ہے جو ہماری آنکھوں نے قانون قدرت کے ماتحت عام طور سے دیکھا ہے لیکن اکثر عام اسباب کے سلسلہ میں نتائج ایسے غیر معمولی ہو جاتے ہیں جن کو دنیا بے مثال کہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ایک طبیب بعض اوقات ایسے مریضوں کو اچھا کر دیتا ہے جن کا اچھا ہونا اس کے قبل دنیا نے نہیں دیکھا تھا، ایک انشاء پرداز بسا اوقات ایسی تحریر لکھ دیتا ہے جس کی نظیر اس کے پہلے آنکھوں کے سامنے نہیں آئی تھی، ایک شاعر بسا اوقات ایسا شعر کہہ جاتا ہے جیسا شعر اس کے قبل نہیں ہوا تھا، ایک کاتب کے ہاتھ سے بسا اوقات ایسے نقوش نکل جاتے ہیں جن کے مثل پہلے آنکھوں نے نہیں دیکھے تھے۔

ہوسکتا ہے کہ اس طبیب، انشاء پرداز، شاعر یا کاتب کو اپنے اس نتیجہ عمل پر پورا بھروسہ بھی ہو اور وہ دنیا کو دعوت بھی دے کہ اگر کوئی میرا مدمقابل ہو تو اس کے مثل بنا کر پیش کرے۔ سعدی اپنی گلستان پر، یا قوت مستعصمی اپنے کتبوں پر اور میر انیس اپنے مرثیوں پر بجا طور سے فخر کر سکتے تھے اور بے نظیر ہونے کا دعویٰ بھی اپنے حدود میں درست تھا۔

اللہ کو کیا ضرورت کہ وہ ان میں سے ہر ایک کے دعویٰ کو غلط ثابت کرے۔ اس لئے کہ بہر حال وہ نتیجہ کمال ہے اسی کے ایک مخلوق کا اور اس کے عطا کردہ طاقتوں کا کرشمہ ہے۔ وہ اگر اس کے دعوائے کمال کو باطل کرنے کے لئے ایک کو پیدا کرے تو پھر ضرورت ہے کہ اس کی بے مثال باطل کرنے کے لئے ایک اور پیدا کیا جائے اور پھر اس کے لئے تیسرا، یہ سلسلہ چلتا رہے تو کہیں پر تو ختم ہوگا تو جو آخر میں ہوگا اس کا دعویٰ پھر لاجواب رہے گا۔ پھر اگر پہلے ہی صاحب کمال کے ادائے بے مثالی کو برقرار رہنے دیا جاتا تو کیا حرج تھا۔ لہٰذا بلاشبہ ہر دور میں ایسی قابلیت کے اشخاص پیدا ہو سکتے ہیں جن کی ایسی قابلیت ان کے غیر میں مفقود ہے اور ایسے نمونے کمال کے سامنے آ سکتے ہیں جن کا مثل و نظیر موجود نہ ہو۔

مگر یہ سب اسی وقت تک ٹھیک ہے جب تک اس کے ساتھ کوئی دعویٰ کسی خداوندی منصب کا نہیں ہے لیکن اگر کوئی اپنے نتیجہ کمال کو یہ کہہ کر پیش کرے کہ اللہ نے مجھے اس عہدہ پر مقرر کیا ہے اور یہ میرا کارنامہ اس کا ثبوت ہے تو اللہ کو لازم ہے کہ وہ کسی کو اتنی قوت عطا کردے کہ وہ اس کے خلاف مظاہرہ کرکے باطل کردے۔

قرآن معجزہ ہے اس لئے کہ وہ ثبوت نبوت میں پیش کیا گیا اور پھر دنیا کو دعوت دی گئی کہ اگر وہ اس رسول کی رسالت میں شک رکھتی ہے تو اس کی مثال پیش کرے۔ اس کے بعد بھی جب دنیا قاصر رہی تو معلوم ہوا کہ وہ حقیقتاً انسانی طاقت سے خارج خدا کی خاص قوت وقدرت کا کرشمہ مخصوص امتیاز اور روحانی اختصاص ہے اور یہ معجزہ ہے جسے ثبوت نبوت کے لئے خالق نے اپنے رسول ﷺ کو عطا کیا ہے۔

قرآن میں معجزات انبیاءؑ کا تذکرہ

بہت سے افراد جنہوں نے اپنے دل خواستہ اور ساختہ و پرداختہ انبیاء کا حلقہ اطاعت زیب گردن کیا ہے اور زمانہ کے موجودہ دور سے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے لئے وہ کچھ معجزات اور خوارق عادات کے ظہور کے ادعا کی جرات نہیں رکھتے، وہ اس کی اپنی کمزوری اور سرمایۂ اعجاز سے بے مائیگی و تہی دستی کو معجزات انبیا کے انکار سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ انبیاء عجیب وغریب مظاہرات پیش کر کے اپنی نبوت تسلیم نہیں کراتے تھے بلکہ صرف ان کی روحانیت تھی جو ان کے لئے قلوب کو جذب کرتی اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بناتی تھی۔

وہ اس سلسلہ میں قرآن کے اندر معجزات انبیاء کے تذکرہ کے وجود کا بھی انکار کردیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں کہیں معجزہ کو دلیل نبوت نہیں بتایا گیا ہے اور نہ رسالت مآب ﷺ کے لئے قرآن نے معجزات کا ادعاء کیا ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے معجزات کا تذکرہ صاف اور صریحی الفاظ میں درج کیا ہے۔ بے شک اس کو ''معجزہ'' کے نام سے یاد نہیں کیا ہے بلکہ ''آیت'' اور ''بیّنہ'' کی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کو متکلمین اپنی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہتے ہیں۔

الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس کر معانی سے کنارہ کشی کرنا صحیح نہیں ہے، ہم کو لفظ معجزہ پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے کہ ہم آپ کے اس لفظ کو قرآن میں تلاش کریں اور اس کی تعریف ڈھونڈھیں۔ قرآن کوئی فرہنگ یا مجموعہ مصطلحات نہیں ہے کہ اس میں لفظ معجزہ اور اس کی تعریف مذکور ہو۔ بے شک ہم کو اس قسم کی دلیل نبوت کا جسے متکلمین اپنی اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں اور جس کے وجود کو ثبوت نبوت میں ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن میں پتہ لگانا چاہئے اگر اس کا پتہ لگ جائے تو الفاظ میں اختیار ہے اور نام رکھنا آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اس کو ''معجزہ'' کہیں جیسا کہ اس لفظ کے معنی لغوی (عاجز کردینے والی چیز) کی مناسبت سے متکلمین کی اصطلاح ہے یا جس لفظ سے قرآن مجید نے ان دلائل کی تعبیر کی وہ، اس لفظ سے تعبیر کیجئے یا کوئی نام اپنے دل سے تجویز کرلیجیے کم سے کم مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اب میں دکھلاؤں کہ قرآن مجید میں اس قسم کی دلیل نبوت کا پتہ ہے یا نہیں اور اسی ذیل میں معلوم ہوگا کہ قرآن نے کس طرح صداقت نبی کی دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قرآن مجید نے حیرت انگیز مظاہرات قدرت اور دلائل نبوت کو جنہیں انبیاء پیش کیا کرتے تھے ''آیات'' اور ''بینات'' کے نام سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٣﴾

قبیلہ ثمود کی طرف ہم نے بھیجا ان کے بھائی صالح کو انہوں نے کہا اے میری قوم والو! عبادت کرو اللہ کی اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ''بینہ'' آگیا ہے۔ یہ خدا کا خاص (پیدا کردہ) ناقہ جو تمہارے لئے ''آیت'' (نشانی) ہے تو اس کو چھوڑے رکھنا کہ یہ خدا کی زمین میں اپنی غذا حاصل کرے اور تم اسے کوئی برائی نہ پہنچانا جس سے تم دردناک عذاب میں مبتلا ہو۔ (سورۂ اعراف

آیت ۷۳)

اس میں ناقۂ صالح کو ''بینہ'' اور اسی کو ''آیت'' کہا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَن لَّا أَقُولَ عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ قَدْ جِئْتُكُم بِبَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَرْسِلْ مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ إِن كُنتَ جِئْتَ بِآيَةٍ فَأْتِ بِهَا إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٠٦﴾ فَأَلْقَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿١٠٧﴾ وَنَزَعَ يَدَهُ فَإِذَا هِيَ بَيْضَاءُ لِلنَّاظِرِينَ ﴿١٠٨﴾

پھر ہم نے ان انبیاء کے بعد مبعوث کیا موسیٰؑ کو اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف تو ان لوگون نے ان آیتوں پر ظلم کیا۔ اب ذرا دیکھو کہ فساد کرنے والوں کا کیا انجام ہے اور موسیٰؑ نے کہا تھا کہ اے فرعون! یقیناً میں خداوند عالم کی طرف سے فرستادہ ہوں اور میرے اوپر لازم ہے کہ میں سوا سچی بات کے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت نہ دوں۔ میں تمہاری طرف ''بینہ'' لے کر تمہارے رب کی طرف سے آیا ہوں بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کردے فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی ''آیت'' لائے ہو تو اسے پیش کرو اگر سچے ہو یہ سن کر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینک دیا جو ایک مرتبہ صاف اژدھے کی شکل میں نمودار ہوگیا۔ اور انہوں نے اپنا ہاتھ نکالا جو تمام دیکھنے والوں کی نظر میں چمکدار نظر آیا۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸)

یہاں عصائے حضرت موسیٰؑ اور ید بیضاء کو ''بینہ'' اور ''آیت'' قرار دیا گیا ہے اس کے بعد ساحران فرعون کی آواز نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے معجزات کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے فرعون سے کہا:

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

تو ہم سے کس بات پر ناراض ہوتا ہے سوائے اس کے کہ ہم اپنے پروردگار کی آیتوں پر ایمان لائے جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں پروردگار! ہم پر صبر کو غالب کردے اور ہمیں ایمان کی حالت میں دنیا سے اٹھا۔ (سورۂ اعراف آیت ۱۲۶)۔ اس کے بعد:

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

ان لوگوں نے کہا جو بھی چاہو تم ''آیت'' ہمارے سامنے پیش کرو کہ ہم پر اس کے ذریعہ سے جادو کرو ہم تم پر ایمان لانے والے نہیں ہیں تو اس وقت ہم نے ان پر بھیجا طوفان اور ٹڈیوں کا لشکر اور جوئیں اور مینڈک اور خون کھلی ہوئی 'آیتیں'، مگر انہوں نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور وہ گنہگار لوگ تھے۔ (سورۂ اعراف آیات ۱۳۲، ۱۳۳)

اس میں پہلے جزء سے صاف ظاہر ہے کہ ''آیت'' اس نوعیت کی چیز کو کہا گیا ہے جن میں کفار جادو کی صورت پاتے تھے اور آخر آیت میں طوفان، جراد، قمل، ضفادع

اور دم، ان تمام غیر معمولی درجہ پر آنے والی آفتوں کو ''آیات مفصلات'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

پھر ہم نے بھیجے ان کے بعد کچھ رسول ان کی قوم کی طرف اور وہ رسول ان کے سامنے لائے ''بینات'' مگر وہ کب ایمان لانے والے تھے اس چیز پر جس کے پہلے تکذیب کر چکے تھے۔ (سورۂ یونس آیت ۷۴)

اس میں نوحؑ کے بعد مبعوث ہونے والے رسولوں کے ساتھ ظاہر ہونے والے امور کو اجمالی طور پر ''بینات'' سے تعبیر کرتے ہوئے پھر ارشاد ہوا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۶﴾ قَالَ مُوْسٰٓى اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ۭ اَسِحْرٌ هٰذَا ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ ﴿۷۷﴾ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاۗءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُوْنِيْ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۷۹﴾ فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ﴿۸۰﴾ فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ ۙ السِّحْرُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

سَيُبۡطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الۡحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۸۲﴾

پھر ہم نے بھیجا ان کے بعد موسیٰؑ و ہارون کو فرعون اور اس کے گروہ کی طرف اپنی ''آیتوں'' کے ساتھ تو انہوں نے ہٹ دھرمی کی اور وہ بڑے گنہگار لوگ تھے۔ تو جب ان کے پاس ان کے پروردگار کے پاس سے سچی حقیقت پیش ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ موسیٰؑ نے کہا کیا تم سچی بات کو جو تمہارے پاس آئی ایسا کہتے ہو؟ کیا جادو ہو سکتا ہے؟ حالانکہ جادوگر کامیاب نہیں ہوا کرتے۔ انہوں نے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہم کو اس سے منحرف کر دے جس پر ہم نے اپنے آباء کو پایا اور تم دونوں کیلئے اس سرزمین پر بڑائی ہو جائے اور ہم تم دونوں پر ایمان لانیوالے نہیں اور فرعون نے کہا کہ میرے پاس ہر کامل جادوگر کو لاؤ تو جب سب جادوگر جمع ہوئے موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ دکھاؤ جو کرتب تم دکھا سکتے ہو جب انہوں نے پھینکا اپنی رسیوں کو تو موسیٰؑ نے کہا کہ جو تم نے پیش کیا ہے وہ سحر ہے اللہ یقیناً اسے بھی باطل کر دے گا اللہ مفسدہ پردازوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا ہے اور جو بات حق ہے اسے وہ اپنے حکم سے پورا کرتا ہے اگرچہ گنہگار لوگ اس کو برا سمجھیں۔ (سورۂ یونس آیات ۷۶ تا ۸۲)

ان آیات میں پورے طور پر اس دلیل عقلی کا خلاصہ موجود ہے جو معجزہ و سحر کے تفرقہ میں ہم نے بیان کیا ہے۔ آیات کے مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہری صورت سے جو امر بطور دلیل نبوت نبی کو عطا ہوا تھا وہ ویسی ہی نوعیت رکھتا تھا جو سحر کی ہوتی ہے یعنی غیر معمولی اور خارق عادت اور خلاف نظام عام اسی بناء پر ان لوگوں نے کہا کہ اِنَّ هٰذَا

لَسِحۡرٌ مُّبِيۡنٌ اور یہی خیال کر کے فرعون نے مقابلہ کے لئے ساحروں کو دعوت دی لیکن پیغمبر نے اس مختصر جملہ سے کہ: أَسِحۡرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفۡلِحُ السّٰحِرُوۡنَ، فلسفہ اعجاز اور آیت الٰہی اور کرشمہ ساحری کے فرق پر مکمل روشنی ڈال دی۔ اس میں اعجاز اور سحر کے مابین فرق کا معیار جو بتلایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر یہ سحر ہوگا تو اس کی کامیابی اور سرسبزی باقی نہیں رہ سکتی اس لئے کہ اللہ پر لازم ہے کہ وہ اس کا ابطال کر دے اور اگر وہ سرسبز و کامیاب ہوا اور اس کا ابطال نہ ہو تو سمجھو کہ حقیقۃً سحر نہیں بلکہ اعجاز ہے اور اس معیار کو اس سے زیادہ واضح الفاظ میں دوسری آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ جب موسیٰؑ علیہ السلام نے ساحروں کی کارستانی دیکھی تو فرمایا۔ ''یہ جو تم نے کیا سحر ہے یقیناً خدا اس کو باطل کر دے گا۔ خدا کبھی فساد برپا کرنے والوں کے کام کو سرسبز نہیں کرتا''

معلوم ہوا معیار سحر یہ ہے کہ اللہ اس کو باطل کر دے وَيُحِقُّ اللّٰهُ الۡحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ٥ یعنی جو واقعی حق ہے اور سچ مچ خدا کی طرف کی نشانی ہے، اس کو وہ اپنے مظاہرات قدرت کے ساتھ برقرار رکھتا ہے چاہئے گنہگار لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار گزرے۔ یہ معیار اعجاز ہے۔ اب اس سے بڑھ کر دلیل عقلی کی طرف اشارہ کیا ہوگا؟

ان آیات سے یہ امر بھی ظاہر ہے کہ اس مظاہرہ قدرت کو جسے ''آیت'' اور ''بینہ'' کہا گیا ہے دلیلِ نبوت اور معیارِ حقانیت کی صورت میں پیش کیا ہے بلکہ درحقیقت ''بیّنہ'' کہنا ان مظاہرات کو اسی اعتبار سے ہے کہ وہ کھلی ہوئی دلیل سچائی کی ہیں اور ''آیت'' کہنا اس لحاظ سے ہے کہ وہ حقانیت کی نشانی ہیں۔

اس کی علاوہ ملاحظہ ہو:

اُسۡلُكۡ يَدَكَ فِىۡ جَيۡبِكَ تَخۡرُجۡ بَيۡضَآءَ مِنۡ غَيۡرِ

سُوۡٓءٍ ۫ وَّاضۡمُمۡ اِلَیۡكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهۡبِ فَذٰنِكَ بُرۡهَانٰنِ مِنۡ رَّبِّكَ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ وَمَلَا۠ئِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۳۲﴾

داخل کرو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں، وہ نکلے گا روشن، بغیر کسی بری صورت کے اور ملا دو اپنی طرف اپنے بازو کو دہشت سے، یہ دونوں دلیلیں ہوں گی تمہارے پروردگار کی طرف سے فرعون اور اس کے پاس کے بڑے آدمیوں کی جانب۔ (سورۂ قصص۔ ۳۲)

اس آیت میں صاف صاف حضرت موسیٰؑ کے معجزات کو ''برہان'' یعنی دلیل نبوت کہا گیا ہے۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات:

جب کہ یہ امر ثابت ہوگیا کہ قرآن میں معجزات کو ''آیات و بینات'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اب قرآن میں تلاش کیجئے، آپ کو حسب ذیل ستائیس مقامات پر واضح اور صاف الفاظ میں ثبوت ملے گا کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی معجزات عطا ہوئے ہیں:

(۱) وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۹۹﴾

یقیناً ہم نے اتارے ہیں آپ پر روشن معجزات اور نہیں انکار کر سکتے ان کا مگر فاسق لوگ۔ (سورۂ بقرہ)

(۲) وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

جو لوگ علم نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں کیوں ہم سے خدا بات نہیں کرتا یا کوئی خاص معجزہ ہمارے پاس کیوں نہیں آتا۔ ایسا ہی کہا تھا انہوں نے جو ان کے پہلے تھے انہیں کا سا قول ان سب کے دل ایک سے ہیں۔ یقیناً ہم نے معجزات ظاہر کر دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں۔ (سورۂ بقرہ)

(۳) فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۰۹﴾

اگر تم نے لغزش کی، بعد اس کے کہ معجزے تمہاری طرف آ چکے تو جان لو کہ

اللہ زبردست ہے ہر کام ٹھیک کرنے والا ہے۔ (سورۂ بقرہ)

(۴) كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ

کیوں کر خدا راہ راست پر لائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے ایمان لانے کے بعد پھر کفر کیا حالانکہ انہوں نے گواہی دی کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس معجزے آئے۔ (سورۂ آل عمران)

(۵) وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾

ان لوگوں کے سامنے جو بھی معجزہ ان کے پروردگار کی طرف سے آتا ہے یہ اس سے روگردانی ہی کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۶) قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو ان لوگوں کی باتوں سے رنج ہوتا ہے تو یہ آپ ہی کو نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ کے معجزوں کا جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۷) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾

جنہوں نے جھٹلایا ہمارے معجزوں کو یہ بہرے ہیں اور گونگے ہیں تاریکی میں مبتلا ہیں۔ (سورۂ انعام)

(۸) وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ

جب آئیں آپ کے پاس وہ لوگ جو ہمارے معجزوں پر ایمان لاتے ہیں تو کہیے کہ سلامتی تمہارے واسطے ہے تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر فرض کرلیا ہے رحمت سے کام لینا۔ (سورۂ انعام۔ ۵۴)

(۹) وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ

جب ان کے پاس کوئی معجزہ آتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ ویسی ہی باتیں نہ آئیں جو اور پیغمبروں کو ملی تھیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغام کس طرح بھیجے۔ (سورۂ انعام۔ ۱۲۴)

(۱۰) فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا

یقیناً آیا تمہارے پاس معجزہ تمہارے پروردگار کی جانب سے اور ہدایت و رحمت تو پھر کون زیادہ ظالم ہوگا اس سے کہ جو اللہ کی طرف کے معجزات کی تکذیب کرے اور ان سے روگردانی کرے۔ (سورۂ انعام۔ ۱۵۷)

(۱۱) وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

جب ہم کسی ایک معجزہ کے بجائے بدل کر دوسرا معجزہ بھیج دیتے ہیں اور اللہ زیادہ واقف ہے اس چیز کے متعلق جسے وہ اتارتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم تو

اپنے دل سے گھڑتے ہو بلکہ اکثر ان میں سے علم نہیں رکھتے۔(سورۂ نحل۔۱۰۱)

(۱۲) إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ۙ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۰۴﴾

وہ جو ایمان نہیں رکھتے اللہ کے معجزات پر اللہ انہیں جبراً راہ راست تک نہیں پہنچائے گا اوران کے لئے دردناک سزا مقرر ہے۔(سورۂ نحل۔۱۰۴)

(۱۳) وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا ۖ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنَاهُمْ سَعِيرًا ﴿۹۷﴾ ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمْ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا

اور ہم ان کو روزِ قیامت اندھا، گونگا اور بہرا محشور کریں گے یہ ان کا بدلا ہے اس کا کہ انہوں نے ہمارے معجزات سے انکار کیا۔(سورۂ بنی اسرائیل۔۹۸)

(۱۴) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس کے پروردگار کی طرف کے معجزات کے ذریعہ سے یاددہانی کی گئی مگر اس نے روگردانی کی۔(سورۂ کہف۔۵۷)

(۱۵) أَفَرَأَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا

کیا دیکھا آپ نے اس شخص کو جس نے انکار کیا ہمارے معجزات کا۔(سورۂ مریم۔۷۷)

(۱۶) وَكَذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يُرِيدُ ﴿۱۶﴾

اور اسی طرح اتارا ہے ہم نے اسے روشن معجزوں کی حیثیت سے اور اللہ منزل تک پہنچاتا ہے جسے چاہتا ہے۔(سورۂ حج۔۱۴)

(۱۷) وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۸﴾

اور وہ جو اپنے پروردگار کے معجزات پر ایمان لاتے ہیں۔(سورۂ مومنون۔۵۸)

(۱۸) وَأَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ

اور ہم نے اس میں معجزات اتارے ہیں جو روشن ہیں۔(سورۂ نور۔۱)

(۱۹) وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ آيَاتٍ مُبَيِّنَاتٍ وَمَثَلًا مِنَ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ

یقیناً ہم نے تمہاری طرف اتارے ہیں واضح معجزات اور ویسی ہی باتیں جو پہلے والوں کو ملی تھیں۔(سورۂ نور۔۳۴)

(۲۰) لَقَدْ أَنْزَلْنَا آيَاتٍ مُبَيِّنَاتٍ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۴۶﴾

ہم نے اتارے ہیں روشن معجزات اور اللہ جس کو چاہتا ہے راہ راست تک پہنچنے کو توفیق خاص عطا کرتا ہے۔(سورۂ نور)

(۲۱) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا

اور کہیے! الحمدللہ! عنقریب ہم تمہیں معجزات دکھائیں گے جنہیں تم پہچانتے

ہو گے (سورۂ نمل ۔ ۹۳)

(۲۲) وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾

جب وہ کوئی معجزہ دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ نہیں ہے مگر کھلا ہوا جادو۔ (سورۂ صافات ۔ ۱۴، ۱۵)

(۲۳) وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور دکھلا رہا ہے تم کو وہ اپنے معجزات تو اللہ کے کن کن معجزات کا تم انکار کرو گے۔ (سورۂ مومن ۔ ۸۱)

(۲۴) وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْئَا اتَّخَذَهَا هُزُوًا

جب ہمارے معجزات میں ان کو کسی کا علم ہوتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (سورۂ جاثیہ ۔ ۹)

(۲۵) وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾

اور جب ان کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ہمارے روشن معجزات تو جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ حق کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔
(سورۂ احقاف ۔ ۷)

(۲۶) وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۶﴾

اور جب کہا عیسیٰ بن مریمؑ نے کہ اے بنی اسرائیل! میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری جانب تصدیق کرنے والا اس توریت کی جو میرے پہلے تھی اور بشارت دینے والا ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا۔ اب جب وہ آیا ان کی طرف معجزات کے ساتھ تو انہوں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ (سورۂ صف ۔ ۶)

(۲۷) وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ ﴿۴﴾

اور نہیں اختلاف کیا ان لوگوں نے کہ جنہیں کتاب عطا ہوئی مگر بعد اس کے کہ ان کی طرف معجزہ آ گیا۔ (سورۂ بینہ ۔ ۴)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ رسالت مآب بھی اسی طرح ''آیات'' اور ''بینات'' کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے جس طرح سابقہ کے انبیاء۔ اس کے علاوہ آیات ۲۲، ۲۵، ۲۷، میں بار بار اس تذکرہ سے کہ وہ لوگ سحر کہتے تھے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو غیر معمولی اور تمام انسانی طاقتوں سے بالاتر مظاہرات نظر آ رہے تھے جس کا جواب ان کے پاس سوا الزام جادوگری کے اور کچھ نہ تھا۔

اب اسے تعصب کی بناء پر دھاندلی کے سوا کیا کہا جائے کہ عیسائی مبلغین اس پر زور دیتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے معجزہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہیں خداوند عالم کی جانب سے معجزات عطا کئے گئے۔ پادری فندر صاحب نے اپنی کتاب ''میزان الحق'' میں اس پر کافی خامہ فرسائی کی ہے۔

ان کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے کم نظر افراد بھی یہ صدا بلند کر بیٹھتے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ایسے اشخاص میں سے ایک نے اس بارے میں قرآن کی ۱۴ آیتوں سے استدلال کی کوشش کی ہے۔ مگر جب ہم ان لوگوں کی استدلالی کائنات پر غور کرتے ہیں تو اصلی حقیقت صاف معلوم ہو جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ سنت الٰہیہ یہ رہی ہے کہ تمام انبیاء کے معجزے یکساں نہ تھے بلکہ ہر نبی کو حکمت و مصلحت کے اعتبار سے خاص معجزات عطا ہوئے۔ ہمارے رسول کو بھی اللہ کی طرف سے خاص معجزات دیئے گئے۔

مشرک لوگ عناد اور تعصب سے ان تمام معجزوں سے سرتابی کرتے ہوئے کبھی مضحکہ کے انداز میں اور کبھی بہانے کے طور پر نئے نئے معجزوں کی فرمائش کرتے تھے، حقیقت طلبی کے جذبہ سے نہیں، بلکہ صرف اپنے انکار کی سخن پروری کے لئے اور کبھی یہ تقاضا کرتے تھے کہ بالکل وہی معجزے جو سابق انبیا کو مل چکے ہیں، ان کو بھی دیئے جائیں۔ ان کے جواب میں کبھی یہ کہا گیا ہے کہ یہ معجزات پہلے انبیاء کو عطا ہوئے، پھر بھی تو لوگوں نے تکذیب کی۔ پھر اب انہی معجزات کے دکھانے کا کوئی حاصل نہیں۔

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۔

(بنی اسرائیل۔۵۹)

اور کبھی خالق کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اگر یہ معجزے دیکھیں گے، تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

وَمَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (سورۂ انعام۔۱۰۹)

اور کبھی یہ کہا گیا کہ معجزے تمہارے سامنے موجود ہیں۔ اگر تم ایمان لانا چاہتے ہو تو وہ کافی ہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ (سورۂ بقرہ۔۱۱۸)

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہر فرد کی فرمائش پر ہی معجزہ ہونے لگے تو معجزہ بازیچہ اطفال بن جائے اس کی غیر معمولی عظمت و اہمیت باقی ہی نہ رہے۔ یقیناً آیات اور معجزات کا پیش کرنا صرف لوگوں کی طلب پر نہیں ہوتا بلکہ خود نبی و رسول کی مرضی پر بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف خداوند عالم کی حکمت و مصلحت کی بناء پر ہوتا ہے اور اسی لئے ارشاد ہوا ہے:

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ

کسی رسول کو اختیار نہیں کہ وہ کسی آیت کو ظاہر کرے مگر خدا کے حکم سے

(سورۂ رعد۔۳۸)

اور اسی کو خاص انداز میں رسولؐ کو مخاطب کر کے ارشاد کیا جس سے درحقیقت عام لوگوں کو تنبیہ مقصود ہے:

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاۗءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ

(سورۂ انعام۔۳۵)

اگر آپ پر ان کی روگردانی بہت سخت ناگوار گزرتی ہے تو اگر آپ میں قدرت ہو زمین میں کوئی سرنگ لے جانے یا آسمان پر سیڑھی لگانے کی تو ایسا کیجئے اور کوئی آیت پیش کر دیجئے (ایسی جسے یہ لوگ ضرور ہی مان لیں)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی پیش کی ہوئی آیتیں ان کے ایمان لانے کے لئے بے کار ثابت ہوئیں تو اب رسولؐ کے امکان میں نہیں ہے۔۔ کہ ایسی آیت پیش کریں جس سے وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں اور رسولؐ کی زبانی ان لوگوں کے مختلف مطالبات

کے جواب میں یہ کہلا یا گیا ہے کہ۔۔۔۔ سُبۡحَانَ رَبِّیۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا۔ پاک ہے خدا کی ذات کیا میں کچھ اور ہوں سوا ایک انسان کے جو رسالت کے عہدہ پر مقرر ہوا ہے یعنی میں اللہ کے ارادہ کا پابند ہوں اور اس کے خلاف کوئی قدرت نہیں رکھتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ مِنۡ رَّبِّىۡ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ (سورة الاعراف۔ ۲۰۳)

جب آپ کوئی خاص آیت پیش نہیں کرتے، تو وہ کہتے ہیں آپ نے اس آیت کو پیش کرنے کے لئے کیوں منتخب نہ کیا؟

(اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے دوسری آیتیں پیش ہو چکی تھیں) کہیے کہ میں تو وحی ربّانی کا پابند ہوں۔ یہ تمہارے پروردگار کی بصیرت افروز نشانیاں اور مومنین کی ہدایت ورحمت کے ذریعہ موجود ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی ضرورت ہرگز نہیں ہے کہ جس آیت کا مطالبہ جس وقت ہو وہ ضرور ہی ان کی خواہش کے مطابق پیش کر دی جائے لیکن یہ اس وقت ہے کہ جب خداوند عالم کی طرف سے درحقیقت ایسے آیات ومعجزات پیش ہو چکے ہوں جو اس نبی کی حقانیت ثابت کرنے کیلئے کافی ہوں۔ لہٰذا کسی شخص کے دعویٰ نبوت کے بعد مطلق معجزہ کا مطالبہ حق بجانب ہوگا۔

لیکن معجزہ کے سامنے آنے کے بعد کسی معجزہ خاصہ کا مطالبہ ضروری نہیں کہ پورا ہو۔ لہٰذا ایک طرف مذکورہ بالا آیات سے عیسائی حضرات کی مطلب برآری کی حضرت رسولؐ اکرم کو مثل انبیاء سابق معجزات ملے ہی نہیں تھے ورنہ آپ معجزہ کی خواہش کو اس طرح مسترد کیوں کرتے ہرگز صحیح نہیں ہے جبکہ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ کے مطالبہ پر

نہ صرف انکار کرنا بلکہ معجزہ کی خواہش کرنے والوں کو سخت وسست کہنا اور اپنے پاس سے نکال دینا اور یہ تصریح کرنا کہ اس زمانہ والوں کو کوئی نشانی نہ دکھلائی جائے گی، موجود ہے۔

دوسری طرف بہائی اور قادیانی جماعتوں کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ نبی و رسول کے لئے معجزہ کی ضرورت ہی نہیں اور نہ کسی کو نبی سے معجزہ کے مطالبہ کا حق ہے۔ یہ آیات قرآنی سے ثابت بھی نہیں ہوتا اور عقلاً بھی درست نہیں ہے معجزہ یعنی کوئی حقیقت کی خاص نشانی اگر نہیں ہے تو اس نبی پر ایمان لانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور سچے جھوٹے میں امتیاز کا کوئی معیار نہیں ہوگا۔

اعجاز قرآن

صدر المتالہین اپنی شرح اصول کافی (مطبوعہ ایران ۱۲۴۱) میں لکھتے ہیں کہ معجزہ وہی ہے جو رسالت کی دعویٰ کے ثبوت میں اعلان بے مثالی کے ساتھ پیش ہو اور پھر دنیا اس کے مقابلہ میں عاجز رہے قرآن میں یہ تمام باتیں موجود ہیں۔ اسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اپنی حقانیت کی دلیل بنا کر پیش کیا۔ فصحائے عرب کو دعوت مقابلہ دی اور جوش دلانے والے انداز میں ان کے جذبہ غیرت وحمیت کو تازیانے لگائے مگر وہ باوجود فصاحت کلام و طاقت بیان میں نازش وافتخار کے قرآن مجید کے جواب سے عاجز وقاصر رہے اور بجائے جواب دینے کے مرنے مارنے پر تیار ہو گئے جس میں انتہائی جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنا پڑے۔

حالانکہ قرآن اول روز سے ان کی ان تمام زحمتوں اور مشقتوں کا معمولی ساحل پیش کر رہا تھا کہ وہ اس کے جواب میں پورا نہ سہی، چھوٹے ہی کسی سورہ کا جواب پیش کر دیں۔

یقیناً اگر انہیں اس پر قدرت ہوتی تو وہ قرآن کے مطالبہ کے مطابق عوض جنگی

ہنگامہ آرائی کے ادبی معرکہ آزمائی کرتے اس صورت میں بغیر کسی خونریزی اور نتیجہ تباہی و بربادی کے اسلام کی آواز پست ہوجاتی لیکن جب انہوں نے قرآن کے پے در پے تازیانوں کے باوجود اس میدان سے گریز ہی پسند کیا اور حرب وضرب، جنگ وجدال کو اس کے تمام مہلک نتائج کے باوجود مقابلہ کے لئے اختیار کیا تو اس سے ان کی عاجزی طشت از بام ہوگئی اور قرآن مجید کا معجزہ ہونا پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا۔

شیخ صدرالدین شیرازی کے لفظوں میں:

دفع تحدی المتحدی بنظم الکلام اھون من الدفع السیف۔

دعوائے بے مثالی کرنے والے کی رد۔ایک کلام مرتب کر کے آسان ہونا چاہئے تھی، بہ نسبت تلوار کے ساتھ مقابلہ کے۔

علامہ نیشاپوری نے کہا ہے:

فاضطتهم التعجیز الی ایثار الاصعب علی الاسهل فتبین ان الاسهل فی النظر الاصعب فینفس الامر و ذالك من اول الدلیل علی حقیقه المنزل و صدق المنزل علیه

یہ معجزانہ حیثیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے آسان راستے کو چھوڑ کر مشکل راستہ اختیار کیا جس سے ثابت ہوا کہ جو ظاہری نگاہ میں آسان تھا (یعنی قرآن کا جواب پیش کرنا) وہ حقیقت میں زیادہ مشکل تھا اور یہ بہت بڑا ثبوت ہے اس کلام کی حقانیت کا جو اتارا گیا اور اس شخص کی سچائی کا جس پر وہ اتارا گیا ہے۔(غرائب القرآن۔ج ۱۔ص ۲)

پھر جب اس دور کے فصحائے عرب باوجود اس اقتدار خاص اور کمال کے قرآن کے مقابلہ میں عاجز رہے تو دوسروں کو مجال دم زدن کہاں ہوسکتی ہے۔اس عاجزی کا تعلق براہ راست اگرچہ فصحائے عرب سے تھا مگر اس سے حقانیت کا جو ثبوت ہے وہ ہمہ گیر حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ معجزہ خاص عرب کے لئے نہیں تھا بلکہ تمام خلق کے لئے۔

اس پہلو کو قدیم ترین عربی کے ادیب عمرو بن بحر جاحظ نے ان الفاظ میں نمایاں کیا ہے۔

ان عجز العرب عن مثل نظم القراٰن حجة علی العجم من جهة اعلام العرب العجم انهم کانوا عن ذالك عجزة۔([1])

قوم عرب کا قرآن کے سے کلام کو پیش کرنے سے عاجز رہنا غیر عرب تمام دنیا کے سامنے حقانیت کا ثبوت ہے جب کہ قوم عرب نے اپنی عاجزی کا اس کے مقابلہ سے اظہار کر دیا ہے۔(البیان والتبیین۔ج ۳۔الطبعۃ الاولیٰ۔ص ۱۷۱ و ط ۴،ص ۲۷۰)

اور پھر اس پر حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کو چودہ سو برس ہوگئے اور قرآن اسی ایک آواز سے اپنی مقابل دنیا کے ہر طبقہ کو صدا دے رہا ہے اور عالم کی فضا اس کے دعوائے بے مثالی سے گونج رہی ہے اور اس کے مخالف اپنی تحریک کی اشاعت اور قرآن کی مخالفت میں سلطنتوں کی طاقت، مال و دولت کا زور اور گراں قدرت خزانوں کا سرمایہ صرف کرتے رہے ہیں۔

---

[1] ۔البیان و التبیین جلد۳۔ الطبقه الاولیٰ ص۱۷۱ و ط۴ ص۲۷۰

لیکن قرآن کی آواز (لا یا تمن بمثلہ) آج تک سچی ہے۔اور سب طرح کی مخالفتیں اور قرآنی عظمت کے گھٹانے کی سرتوڑ کوششیں ہوئیں قرآن پر (بزعم خود) ادبی اعتراضات کئے گئے۔قرآن واقعات کو بخیال خود مشکوک ثابت کیا گیا۔قرآن کے مضامین کو کتب سابقہ سے ماخوذ بتایا گیا۔قرآن میں مسلمانوں کی کتابوں سے تحریف کے ثبوت پیش کئے مگر یہ نہ ہوا کہ کوئی ایک قرآن کے کل نہ سہی،بعض کا جواب تحریر کردیتا۔

جیسا کہ صدر شیرازی نے تحریر فرمایا:

لو كان بظهر فان ارذل الشعراء لم تحدّوا بشعرهم و عورضوا ظهرت المعارضات و المناقضات الجارية بينهم

اگر ایسا کبھی بھی ہوا ہوتا تو نمایاں ہوتا اس لئے کہ معمولی شعراء نے جب اپنے کلام کے لئے چیلنج کیا اور ان کے جواب دیئے گئے تو یہ مقابلے والے جوابات شہرہ آفاق ہوگئے۔

(شرح اصول کافی مطبوعہ ایران۔ص ۴۴۱)

پھر یہاں صورت حال یہ ہے کہ حقانیت قرآن کی مخالف جماعتیں بکثرت ہیں۔ چاہے وہ جواب کسی ایک مذہب یا جماعت کی کسی فرد کا نتیجہ قلم ہوتا ہے مگر یہ تمام جماعتیں اس کی اشاعت میں متفق ہو جاتیں بلکہ اگر وہ بالکل اس کے مثل نہیں، کچھ اس کے لگ بھگ اور ذرا قریب بھی ہوتا تو یہ لوگ اپنے تعصب سے اسے قرآن سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے اور سب مل کر یہ کہتے کہ قرآن کا دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ہوگیا۔ جب ایسا نہیں ہوا تو صاف ثابت ہوا کہ قرآن کے مقابلہ میں دنیا کی طاقت حقیقۃ قاصر تھی، قاصر ہے اور یقین کرنا چاہیے کہ ہمیشہ قاصر رہے گی۔

سلسلہ معجزات میں قرآن کا امتیاز

تمام انبیاء آیت و بینات یعنی معجزات کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن ان کی نبوتوں کے چراغ خاموش ہوگئے اس لئے کہ ان کی بنیاد ایسے معجزات پر تھی جو وقتی حیثیت رکھتے تھے۔اس وقت وہ منکروں پر اتمام حجت کے لئے کافی تھے مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ان کی صحت وواقعیت روایات اور مختلف المضمون حکایات کی رہین منت ہوگئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر یہود سے موسیٰؑ کی نبوت کا ثبوت کوئی شخص منکر ہو کر طلب کرے یا عیسائیوں سے عیسیٰؑ کی نبوت کا، تو انہیں سوا خاموشی کے چارہ کار نہیں کیوں کہ ان کی کوئی نشانی جیتی جاگتی ہوئی حیثیت نہیں رکھتی اور کسی نبی نے ایسا معجزہ اپنے بعد نہیں چھوڑا جو تمام اہل عالم کے سامنے رکھ دیا جائے کہ ہر زمانہ کے لوگ اپنے اپنے دور کے ذرائع اور اپنے ترقی یافتہ دماغوں کے معیار سے اس کا جانچ سکیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرسکیں۔

بس ایک پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں جنہوں نے معجزہ ایسا پیش کیا جو آپؐ کی نبوت کے لئے ہر دور میں دلیل حسّی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر زمانہ میں حضرت کی نبوت کو تقلیدی حیثیت سے نکال کر تحقیقی دائرہ میں لانے کا ضامن ہے یہ قرآن ہے جس کے زیر دامن پیغمبر اسلام ﷺ کی رسالت کا چراغ انقلابات زمانہ کی ہزاروں آندھیوں میں بھی روشن ہے اور اپنے اعجاز کی روح کے لئے ہوئے ہر انسان کو غور وخوض کی دعوت دیتا ہے اور ہر ادیب جو قرآن کی زبان کو بحیثیت عربی کے سمجھ سکتا ہے (چاہے وہ ایمان رکھنے والوں میں سے نہ ہو) پہلی نظر میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک زندہ زبان کے ایک اہم کارنامے کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہی دلچسپی اسے کچھ زیادہ غور پر آمادہ کردے تو وہ آخر میں یقین کرے گا کہ وہ ایک زندہ نبوت کی زندہ دستاویز کا مشاہدہ کر رہا ہے۔

قرآن مجید کی حیثیتِ اعجاز

وہ لوگ جو قرآن مجید کو معجزہ سمجھتے اور خداوندی کلام تسلیم کرتے ہیں ان میں اس حیثیت سے تھوڑا سا اختلاف ہو گیا ہے کہ قرآن مجید کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ اس کے قائل ہو گئے کہ قرآن صرف وسلب قوی کے اعتبار سے معجزہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خالق کی قوت قاہرہ کا یہ ایک کرشمہ ہے کہ جب کوئی قرآن کا جواب لکھنا بھی چاہئے تو اس کی قوت سلب ہو جائے اور اس کی طاقت جواب دیدے۔

اگرچہ منطقی طور پر نتیجہ اعجاز کے لحاظ سے اس قول سے کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر واقعیت کے لحاظ سے وہ درست نہیں ہے باوجود سید کی جلالت قدر کے جمہور علماء نے اس کو رد کر دیا۔ کیونکہ ان کے قول کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ قرآن میں خود کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا جواب لانے سے فصحائے عرب قاصر ہوتے لیکن یہ اللہ کی قدرت ہے کہ اس کا جواب دینے پر کسی کو قدرت نہیں ہوتی اور جب کوئی شخص اس کا جواب لکھنا چاہئے تو اس کی قوت کو سلب کر دیتا ہے اور موانع پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن بے لوث وجدان کا فیصلہ ہے کہ جب ہم جواب کی نیت سے خالی الذہن ہو کر بغیر کسی خیال معارضہ ومقابلہ کے بھی آیات قرآن پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانی سطح سے بلند شان رکھتا ہے چنانچہ شریف مرتضیٰ کے چھوٹے بھائی جامع نہج البلاغہ علامہ شریف رضی جو عربی ادب میں بڑے بھائی سے اونچا درجہ واقعًا چاہے نہ رکھتے ہوں لیکن بحیثیت ادیب ان سے زیادہ نمایاں ضرور ہیں اپنی بیش قیمت تصنیف ''حقائق التاویل'' مطبوعہ نجف اشرف (صفحہ ۱۰۲) میں لکھتے ہیں:

انہ لیریٰ فیہ عند الانفراد بتلاوتہ من غرائب الفصاحۃ ونواقب البلاغتہ ونوادر الخواطر عن الکلام

علیہ والایضاح من عجائب مافیہ.

انسان جب تنہائی میں اس کی تلاوت کرے تو فصاحت کے ایسے عجائب انداز بلاغت کے حیرت ناک اسلوب بے مثال الفاظ اور حکمتوں کے ایسے سرچشمے دیکھے گا جس پر گفتگو کرنے اور ان عجائبات کی تشریح کرنے سے انسانی ذہن عاجز ہوگا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اعجازی صفت خود قرآن میں مستقل طور پر موجود ہے، نہ یہ کہ کسی آدمی کے مقابلہ کی نیت سے قلم اٹھاتے وقت ہر دفعہ اللہ کی طاقت کے لئے حرکت میں آنے کی ضرورت ہو اور ایسے آدمی کے مقابلہ میں خاص طور سے وہ اپنی قدرت سے کام لیا کرے۔

ایک دوسرا خیال جو بالکل غلط ہے، یہ ہے کہ قرآن بحیثیت اپنی فصاحت و بلاغت کے معجزہ نہیں ہے اور نہ باعتبار اپنے الفاظ ومعانی کی جامعیت کے بلکہ اس کے معجزہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ ایک مکمل اور کامل اثر ونفوذ رکھنے والا قانون ہے اور اس میں حسب اقتضائے زمانہ انسان زندگی کے تمام شعبوں کے لئے احکام بوجہ اتم موجود ہیں۔

یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس صورت میں قرآن مجید کے بس مجموعی طور پر مقابلہ کا سوال پیش کیا گیا ہوتا نہ کہ دس سورتوں کے مقابلہ کی دعوت بلکہ آخر میں صرف ایک سورہ کے جواب کی طلب پھر یہ کہ لاجوابی کا اعلان تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ ابتدا ہی سے ہونے لگا، لیکن یہ جہت اعجاز پیدا ہوتی ہے پورے قرآن کی تنزیل کے بعد اگر اس کے معجزہ ہونے کے یہ معنی ہوتے تو مطالبہ جواب کا تمام قرآن کے نازل ہونے کے بعد ہوتا نہ کہ اثنائے تنزیل میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہت اعجاز کوئی ایسی ہے جو کل و

جز میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔

بے شک یہ بھی درست نہیں ہے کہ قرآن کی اعجازی حیثیت بس فصاحت و بلاغت میں منحصر ہے، فصحائے عرب کے لئے وہ بحیثیت فصاحت معجزہ تھا مگر چوں کہ وہ ہر زمانہ میں باقی رہنے والی دلیل بیّن بنا کر بھیجا گیا لہٰذا اس میں بلند اور پست ظاہر بین اور دوررس ہر درجہ کے دماغوں کے لئے جہات اعجاز موجود ہیں اور فصاحت و بلاغت والے اعجاز کے علاوہ وہ باعتبار معارف وحقائق، باعتبار نکات ودقائق، باعتبار جامعیت ووسعت علوم، باعتبار متانت وبلندی تہذیب اور پھر باعتبار اپنے تعلیمات وہدایت کے ہر دور زمانہ کے لئے معجزہ ہے۔

قرآن کے تازہ ترین معجزات

طبیعات وفلکیات میں دنیا برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور اسی میں کوئی شبہہ نہیں کہ بہت سے دروازے حکمت وفلسفہ کے جو سابق زمانہ میں بند تھے وہ اب کھل گئے ہیں یا کھل رہے ہیں اور سینکڑوں رموز جو اس کے پہلے راز سربستہ کی حیثیت رکھتے تھے اب منکشف ہوتے جاتے ہیں۔

اگر چہ ان انکشافات میں کچھ ظنی یا وہمی بھی ہوتے ہیں اور ان میں انداز، تخمین یا تخیل اور تمثیل وقیاس کی آمیزش ہوتی ہے اس لئے میں اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ مذہبی آیات وروایات کو کھینچ تان کر جدید تحقیقات پر منطبق کیا جائے۔ یہ کوشش اس لئے صحیح نہیں کہ انسانی فلسفہ وعلم تبدیل ہونے والی چیز ہے اور دین ثابت و برقرار حقیقتوں پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ثابت ولازوال چیز کا متغیر اور تبدیل چیز سے دائمی طور پر تطابق نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا اگر دینی تصریحات کسی موجود تحقیقات فلسفی کے خلاف ہوں تو ہمیں یہ ماننا

ناگزیر ہے کہ فلسفہ ابھی اس بلندی کے درجہ تک نہیں پہنچا کہ اس حقیقت کا صحیح انکشاف ہو سکے۔ پھر بھی اس میں شبہہ نہیں کہ سائنس کے بعض تازہ معلومات ایسے ہیں جن کا پتہ قرآن اور احادیث سے صاف صاف چلتا ہے۔ اس قسم کے آیت ہم کو قرآن کے تازہ ترین اعجاز کے پہلو سے روشناس کرتے ہیں کہ وہ چیزیں جو ہزاروں سال تک پردہ خفا میں رہیں اور اب ہزاروں قسم کے جدید آلات رصدیہ اور مختلف قسم کے دوربینوں سے ان کا پتہ چلایا گیا ہے نبی امیؐ کے لائے ہوئے قرآن میں وہ تیرہ چودہ سو برس پہلے مذکور تھیں۔

بعض آیتیں قرآن کی ایسی ہیں کہ ان کو جب ہیئت قدیم کے قدیمی مسلمات کی بناء پر جانچا گیا تو کسی طرح ان کے ظاہری طور پر معنی سمجھ میں نہ آئے لہٰذا مفسرین نے جو ان علوم کو بالکل درست مانتے تھے ان آیات میں تاویلات سے کام لیا لیکن اب جس وقت کی ہیت نے پلٹا کھایا ہے اور علم کے دور میں انقلاب آیا ہے تو وہ آیات بغیر تاویل کے اسی حقیقت کو ظاہر کر رہے ہیں جن کا انکشاف اب ہوا ہے۔ عراق کے فلسفی عالم علامہ سید ہبۃ الدین شہرستانی نے ایک کتاب ''الهیئة دارالاسلام'' تقریباً آج سے نصف صدی پہلے تحریر فرمائی تھی جو عراق میں شائع ہوئی اور اس کا اردو ترجمہ مولانا محمد ہارون صاحب اعلی اللہ مقامہ نے ''البدر التمام'' کے نام سے کیا جو دفتر ''البرہان'' لدھیانہ سے شائع ہوا۔

اس میں اگر چہ بہت سے تاویلات پہلی قسم میں داخل ہیں جن کی نوعیت سے میں اختلاف کا اظہار کر چکا ہوں لیکن بہت سے نمونے دوسری قسم کے بھی موجود ہیں اور بعض مسائل انکشافات جدید کے واقعی قرآن واحادیث کے تصریحات سے پورے طور پر ثابت ہوتے ہیں جن میں کسی تاویل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری کی کتاب ''القران والعلوم العصریہ'' اور شیخ عبدالحلیم علی بدیراز ہری کی کتاب ''القرآن والعلوم العصریہ'' اور ''معجزات القرآن العشرین'' بھی اس سلسلہ میں اچھی کتابیں ہیں لیکن شیخ طنطاوی نے جو اس رنگ میں پوری

تفسیر لکھ ڈالی ''جواہرا القرآن'' وہ ویسی ہی دوراز کار تاویلات اور غیر قانونی علوم کی بہتات سے باوجود اپنی وسعت دامن اور مصنف کی انتہائی عرق ریزی کا ثبوت ہونے کے بحیثیت تفسیر غیر مقبول شے بن گئی۔عم معظم مولانا سید احمد صاحب قبلہ علامہ ہندی کی کتاب ''فلسفہ الاسلام'' میں بھی قرآن اور علوم عصریہ میں تطابق کے سلسلہ میں کافی فکر انگیز مواد موجود ہے جس کے بہت سے اجزاء غیر مطبوعہ رہ گئے اور معلوم نہیں قلمی شکل میں بھی محفوظ ہیں یا نہیں۔

قرآن کے امتیازی خصوصیات بحیثیت اسناد واعتبار

ہم نے اپنی کتاب ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں بہت تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے، کہ جتنی کتابیں اس وقت الہامی سمجھی جاتی ہیں اور وحی آسمانی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کے متعلق اگر خود ان کے ماننے والوں کے تحریرات کی روشنی میں نظر کی جائے تو ان کی تاریخ زندگی ایسے حوادث وانقلابات کا مجموعہ نظر آتی ہے جن کی بناء پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے کسی جزء کا بھی دنیا میں وجود باقی ہے اور جسے اب اس کے متبعین سر اور آنکھوں پر رکھ رہے ہیں اور خدا کا کلام سمجھتے ہیں اس میں کوئی آدھا یا چوتھائی جزء بھی ایسا ہے جو اس حقیقی وحی سے عینًا مطابق ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی تھی۔اس کے برخلاف جب ہم اسلامی کتاب ''قرآن کریم'' پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسی تمام کمزوریوں سے بلند نظر آتی ہے اور اس کی تاریخ ایسے خصوصیات پر مشتمل ملتی ہے جو اس کے استناد واعتبار کے ضامن ہیں۔

پہلی خصوصیت:

امت اسلامیہ کو جو قرآن مجید کی امانت دار اور اس کی حفاظت ونگہداشت کی

براہ راست ضامن سمجھی جا سکتی ہے، وہ حقیقی معنی میں باختلاف زمانہ اس کے صحیح تعلیمات سے کتنی ہی دور جا پڑی ہو اور اس کی بناء پر اہل معنی اس پر ارتداد کا حکم لگا دیں لیکن ایسا کوئی وقت نہیں آیا کہ اس نے قرآن کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے کا معاذ اللہ اعلان کیا ہو اور برملا کفر وشرک اختیار کیا ہو بلکہ جس وقت سے مسلمانوں نے دنیائے وجود میں قدم رکھا ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی رہی اور وہ برابر اسلام کو اپنا نشان قومیت اور قرآن کو اپنا طرہ دستار بنائے رہے

دوسری خصوصیت:

قرآن مجید کے متعلق کبھی کوئی پابندی عاید نہیں کی گئی کہ اس کا نسخہ کسی خاص فرد یا جماعت کے پاس محدود رہے بلکہ عام طور پر مسلمانوں کو یہ حق حاصل رہا کہ وہ اسے لکھیں نقل کریں اور از بر یاد کریں۔

تیسری خصوصیت:

قرآن اپنی اصلی زبان (عربی) میں موجود ہے اور صرف اتنا نہیں بلکہ ہر مسلمان قرآن بس اسی کو سمجھتا ہے جو خاص الفاظ پر مشتمل ہے ان کے شرعی احکام بھی اسی قرآن سے تعلق رکھتے ہیں، نماز میں اس کا پڑھنا لازم اور دوسرے اوقات میں اس کی تلاوت باعث اجر وثواب یہ احکام تراجم قرآن پر مرتب نہیں ہیں ترجمہ جس زبان کا ہو وہ ترجمہ ہی کہلاتا یہ کوئی مسلمان اسے قرآن نہیں سمجھتا۔

چوتھی خصوصیت:

قرآن مجید کے آیات کو متفرق طور پر خود رسالت مآبؐ بوقت ورود ہی قلمبند کر

ایسا کرتے تھے اور پھر ان متفرق آیات کو بعد حضرتؐ کی وفات کے تقریباً فوراً ہی کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا جن کی تصدیق وقتاً فوقتاً ان ہستیوں نے کی جنہیں حفاظت قرآن کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔

پانچویں خصوصیت:

قرآن میں خود قدم قدم پر اس کے مُنَزَّلٌ مِنَ اللهِ ہونے کا اعلان ہے اور کسی دوسرے شخص کا کیا ذکر رسول کا ذاتی کلام ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

چھٹی خصوصیت:

قرآن کی اصلیت وحقانیت کے بارے میں مسلمانوں میں باوجود آپ کے سینکڑوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ اس اسے متفقہ حیثیت سے کلام الٰہی سمجھتے ہیں۔

ساتویں خصوصیت:

قرآن کے متعلق اس کے ماننے والے اس نقطہ پر متفق ہیں کہ وہ دنیا کے آخری دور تک رہنما بنا کر بھیجا گیا ہے اور اس کے تعلیمات کسی خاص زمانہ سے مخصوص نہیں ہیں۔

آٹھویں خصوصیت:

قرآن جب سے کتاب شکل میں مدون ہو کر مسلمانوں میں منتشر ہوا، اس کی ایک ایک لفظ کی ہر دور میں جانچ پڑتال ہوتی رہی اور تمام مسلمان بلاتفریق فرقہ اس کی کتاب، قرات اور تفسیر وتشریح کی طرف متوجہ رہے جس سے قرآن مجید میں اب کسی دور میں تصرف اور تحریف کا امکان نہیں رہا۔

نویں خصوصیت:

قرآن مجید کا انداز بیان خود ہی اپنا معیار ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے فصیح کلام میں بھی قرآن کا ایک جملہ آجاتا ہے تو وہ اس طرح نمایاں ہوتا ہے جیسے سنگریزوں میں موتی اور نہیں تو ستاروں میں ماہتاب۔

پانچواں تبصرہ

جمع وتدوین قرآن

قرآن مجید تدریجی حیثیت سے تیئس برس کے عرصہ میں رسالت مآبؐ پر نازل ہوا۔مختلف حالات اور واقعات کی مناسبت سے آیات اور کبھی پورے پورے سورے آپؐ پر اترتے اور آپؐ ان کی تبلیغ فرمادیتے تھے اور کوئی لکھنے والا جب آجاتا تھا تو اسے کاغذ یا چمڑے یا درخت کی چھال جو کچھ ملتا اس پر لکھوا دیا کرتے تھے۔

لیکن عرب میں کتابت اور قرات کا رواج بہت کم تھا اس لئے ذوق حفظ ان میں ترقی پر تھا۔لہٰذا قرآن کے لئے بھی شروع میں حفظ ہی کا طریقہ اختیار کیا گیا اور بیرون جات میں جہاں جہاں لوگ مسلمان ہوتے وہاں قرآن کی تعلیم کے لئے معلمین کو روانہ کیا جاتا تھا اور جتنا جس کو ممکن ہوتا تھا اتنا اس کو قرآن حفظ کراتے تھے لیکن یہ حفظ تنہا حفاظت وحی الٰہی کی ضمانت نہیں بن سکتا تھا جب تک وہ کتابی شکل میں مدون اور محفوظ نہ ہو۔

رسولؐ کے حکم سے بروقت جو کتابت ہوتی تھی وہ متفرق اور غیر مرتب صورت رکھتی تھی اس لئے بعد رسولؐ جو سب سے اہم ضرورت تھی وہ یہ کہ ان اجزاء کو مرتب صورت سے کتاب کی شکل میں لے آیا جائے۔

مگر یہ عام صحابہ کے بس کی بات نہیں تھی۔کتاب کے اوراق ہوں تو انتہائی زحمت کے ساتھ سہی کوئی ان کی ترک ملا دے مگر آیتیں قرآن کی جو متفرق چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑوں، چمڑے کے حصوں اور درخت خرما کی چھالوں پر ہوں، ایک ڈھیر کی صورت میں کسی انسان کے سامنے رکھ دی جائیں تو کس میں قدرت ہے کہ انہیں اصل سلسلے کے مطابق مرتب کردے۔

پھر صحابہ تو ہر وقت رسولؐ کی خدمت میں موجود نہیں رہتے تھے ان میں سے بہت سے حضرات بعد ہجرت اسلام لائے تھے اور قرآن اس کے پہلے سے نازل ہو رہا تھا۔ان میں زیادہ تر تجارت پیشہ اور کاروباری لوگ تھے ان میں سے اکثر بس نماز میں پڑھنے بھر کے لئے جتنے قرآن کی ضرورت تھی وہ یاد کر لیتے تھے پورا قرآن ہر ایک آدمی کہاں یاد کر سکتا تھا چہ جائیکہ اس کے آیات کی پوری ترتیب اور شان نزول اس کے لئے ایسی ہستی کی ضرورت تھی جسے خاص طور پر خدا و رسولؐ کی طرف علم قرآن عطا ہوا ہو جو آیات کی ترتیب اور شان و کیفیت نزول سے پورے طور پر مطلع ہو یہ ذات حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی تھی جو خالق کی جانب سے اس فریضہ کو انجام دینے کے ذمہ دار تھے اور رسولؐ نے انہی کو تمام دینی امانتوں کا محافظ بنایا تھا۔چنانچہ پیغمبرؐ خدا کی ودیعتیں سب انہیں کے سپرد تھیں اور وہ قرآن کا مکتوبی ذخیرہ بھی تمام وکمال انہی کے پاس تھا اور رسالت مآبؐ نے آپ کے لئے اعلان فرما دیا تھا کہ عَلِیٌّ مَعَ الْقُرْاٰنِ وَالْقُرْاٰنُ مَعَ عَلِی۔علیؑ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علیؑ کے ساتھ۔'' اور اس سلسلے کا نام لے کر جس کی پہلی کڑی آپ تھے قرآن کے ساتھ مرکز تمسک قرار دیا تھا اس طرح کہ اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقْلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَبَیْتِیْ۔ مگر رسولؐ کی وفات کے بعد جب اقتدار اپنے مرکز سے ہٹا تو ارباب اقتدار کے سیاسی مصالح اس کے متقاضی نہ تھے کہ قرآن کے ساتھ علی ابن ابیطالبؑ کا نام ہر مسلمان کے ذہن پر نقش ہو۔لہٰذا باوجودیکہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے سب سے مقدم یہی کام سمجھا اور اسے اس سرگرمی سے انجام دیا کہ قسم کھائی کہ ردا اپنے دوش پر نہ ڈالوں گا اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر سے باہر نکل کر کہیں آؤں جاؤں گا نہیں جب تک قرآن کو کتابی صورت سے اس کی تنزیلی ترتیب کے مطابق جمع نہ کردوں۔چنانچہ چند ہی روز میں آپ نے اس کام کو انجام دے دیا، مگر جب اسے آپ نے ارباب اقتدار کے سامنے پیش کیا تو وہاں سے اسے رد کر دیا گیا اور کہا' ہمیں اس کی

ضرورت نہیں ہے۔

آپ خاموشی کے ساتھ اپنے اس جمع کردہ مصحف کو واپس لائے اور اپنے ذخیرہ خاص میں محفوظ کر دیا۔

اب کچھ عرصہ تک اہل اقتدار ملک کے مختلف اطراف میں بھڑکتے ہوئے بدامنی کے شعلوں کو بجھانے میں مصروف رہے' جب اس سے فرصت ہوئی اور ان لڑائیوں میں حفاظ قرآن کی کثیر تعداد قتل ہوگئی اور خوف پیدا ہوا کہ حاملانِ قرآن کے قتل ہونے کے سبب کہیں قرآن کا کثیر حصہ تلف نہ ہو جائے تو اس وقت جمع قرآن کی ضرورت محسوس کی اور اس خدمت کو زید بن ثابت کے سپرد کیا گیا جو رسالت مآبؐ کے آخری زمانہ کے کم عمر صحابہ میں سے ایک فرد تھے اور حفظ قرآن شوق و ذوق سے کیا تھا، انہوں نے بڑی جانفشانی و عرق ریزی کے ساتھ کچھ اپنے حافظہ کی مدد سے اور کچھ صحابہ کے پاس سے متفرق طور پر تھوڑے تھوڑے اجزاء جو تھے، ان سب کو سامنے رکھ کر اور دوسرے صحابہ سے پوچھ کر قرآن مجید کو حکومت وقت کے زیر سایہ جمع کیا۔

اب یہ وہی حکومت کے سیاسی تقاضے تھے کہ جمع قرآن کیلئے اتنے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس ایک ذات کی انجام دی ہوئی خدمت سے فائدہ اٹھایا جاتا جو مسلم طور پر سے بڑی عالم قرآن ہستی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ترتیب آیات تنزیل کے مطابق نہ ہو سکی اور اس سے یہ بڑا علمی خسارہ ہو گیا کہ ناسخ و منسوخ کی شناخت مشکل ہوگئی اور بعض آیات کی تاویل و تفسیر جو خود سیاق و سلسلہ کلام سے معلوم ہو جاتی اب دشوار ہوگئی جس پر اثنائے تفسیر میں ہم جابجا روشنی ڈالیں گے۔

لیکن یہ خود معنوی طور پر قرآن مجید کے اسلوب کا ایک معجزہ تھا کہ غیر مرتب شکل میں یکجا ہونے کے بعد بھی اس کے آیات کی افادیت برقرار رہی اور اس کی معجزانہ شان فصاحت و بلاغت کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اس کے ساتھ چوں کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب علیہ السلام

نے اس کے بالمقابل اپنے جمع کردہ قرآن کی اشاعت کرنا ضروری نہیں سمجھی۔ اس سے یقینی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ موجودہ صورت سے جو کتاب جمع ہوئی اس میں کوئی فروگذاشت ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے اس کی حقانیت کو صدمہ پہنچا ہو۔ اس طرح واقعی و حقیقی اجماع ہو گیا اس قرآن کی حقانیت پر جو بین الدفتین موجود ہے جس میں کسی اسلامی فرقہ کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

چھٹا تبصرہ

نفیِ تحریف

اگر حضرت امیر المومنین علیؑ بن ابیطالبؑ اس قرآن کی اشاعت پر جو ارکان حکومت کی جانب سے مرتب کیا گیا تھا صرف سکوت اختیار فرماتے تو بھی وہ اس کی حقانیت کی دلیل ہوتا واقعہ یہ ہے کہ حضرت نے اس پر سکوت ہی نہیں فرمایا بلکہ اپنے کلمات میں گویا اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس کے اتباع کی دعوت دی اور اسے معاش اور معاد کے تمام معاملات میں حجت خدا بتلایا۔

اسے میں ہی نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ہر نقطہ نظر کے شیعہ اس پر متفق ہیں چنانچہ ''عقائد و مسلمات'' کے نعرے لگانے والی جماعت کے ایک رکن رکین مولوی سبط الحسن صاحب ہنسوی اپنے مضمون ''تاریخ خط و خطاطی میں علیؑ کا مقام'' (شائع شدہ الارشاد بڈگام کشمیر جمادی الثانی و رجب ۱۳۸۶ھ اکتوبر و نومبر ۱۹۶۶ء میں لکھتے ہیں:

''باوجود مصروفیت حضرتؑ نے متعدد نسخے قرآن کے تحریر فرمائے جو نقل ہیں اسی نسخہ قرآن کی جس پر امت نے اجماع کیا تھا گویا اس عمل سے امیر المومنینؑ نے مروجہ مصحف کے کلام الٰہی ہونے کی تصدیق فرما دی جو آپ نے منصب امامت کا فرض اولین تھا۔ (الارشاد۔ ص ۲۷)

نہج البلاغہ میں جو آپ کے ارشادات کا مجموعہ ہے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں

ایک خطبہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

اَللّٰہَ اللّٰہَ اَیُّهَا النَّاسُ، فِیمَا اسْتَحْفَظَکُمْ مِنْ کِتَابِهِ،

وَاسْتَوْدَعَکُمْ مِنْ حُقُوقِهِ، فَاِنَّ اللّٰہَ سُبْحَانَهُ لَمْ یَخْلُقْکُمْ عَبَثًا، وَلَمْ یَتْرُکْکُمْ سُدًی، وَلَمْ یَدَعْکُمْ فِی جَهَالَةٍ وَلَا عَمًی، قَدْ سَمّٰی آثَارَکُمْ، وَعَلِمَ اَعْمَالَکُمْ، وَ کَتَبَ آجَالَکُمْ، وَاَنْزَلَ عَلَیْکُمُ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ وَعَمَّرَ فِیکُمْ نَبِیَّهُ اَزْمَانًا، حَتّٰی اَکْمَلَ لَهُ وَلَکُمْ . فِیمَا اَنْزَلَ مِنْ کِتَابِهِ وَدِینَهُ الَّذِی رَضِیَ لِنَفْسِهِ.

اللہ کا پاس کرواے لوگو! کتاب خدا کے بارے میں جس کا محفوظ رکھنا اس نے تم سے چاہا ہے اور تمہیں اس کے حقوق کا امانتدار بنایا ہے کیوں کہ اللہ نے تم کو بیکار نہیں پیدا کیا اور نہ یوں ہی چھوڑ در کھا ہے اور نہ تمہیں بے خبری اور اندھے پن میں چھوڑ دیا ہے اس نے تمہارے حالات مقرر کر دیئے اور تمہاری کارگزاریوں پر نشان کھینچ دیئے ہیں اور تمہاری عمریں قلمبند کر دی ہیں اور تم پر کتاب اتاری ہے جس میں ہر چیز کا بیان ہے اور اس نے تمہارے درمیان اپنے نبیؐ کو ایک زمانہ تک زندہ رکھا یہاں تک کہ اس نے ان کے لئے اور تمہارے لئے اس کتاب میں جو اتاری ہے اپنے اس دین کو مکمل کر دیا ہے جسے اس نے اپنا پسندیدہ قرار دیا ہے۔ (خطبہ ۸۴)

دوسرے خطبہ میں ہے:

تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ فَاِنَّهُ اَحْسَنُ الْحَدِیثِ، وَتَفَقَّهُوا فِیهِ فَاِنَّهُ رَبِیعُ الْقُلُوبِ، وَاسْتَشْفُوا بِنُورِهِ فَاِنَّهُ شِفَاءُ الصُّدُورِ، وَاَحْسِنُوا تِلَاوَتَهُ فَاِنَّهُ اَنْفَعُ الْقَصَصِ.

قرآن کی تعلیم حاصل کرو، اس لئے کہ وہ بہترین کلام ہے اور اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرو کہ وہ کشت دل کے لئے بہار ہے اور اس کی روشنی سے اپنی بیماریوں کو دور کرو اس لئے کہ وہ سینوں کے لئے شفاء ہے اور اس کی تلاوت خوب کرو کیوں کہ وہ واقعات کا بہترین تذکرہ ہے۔(خطبہ ۱۰۸)

تیسرے موقع پر تحکیم کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا لَمْ نُحَكِّمِ الرِّجَالَ، وَإِنَّمَا حَكَّمْنَا الْقُرْآنَ. وهٰذَا الْقُرْآنُ إِنَّمَا هُوَ خَطٌّ مَسْتُورٌ بَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ لَا يَنْطِقُ بِلِسَانٍ، وَلَا بُدَّ لَهُ مِنْ تَرْجُمَانٍ، وَإِنَّمَا يَنْطِقُ عَنْهُ الرِّجَالُ. وَلَمَّا دَعَانَا الْقَوْمُ إِلَى أَنْ نُحَكِّمَ بَيْنَنَا الْقُرْآنَ لَمْ نَكُنِ الْفَرِيقَ الْمُتَوَلِّيَ عَنْ كِتَابِ اللهِ.

ہم نے انسانوں کو حکم نہیں بنایا تھا بلکہ قرآن کو حکم بنانے پر راضی ہوئے تھے اور یہ قرآن وہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان لکھا ہوا تحریر کی صورت موجود ہے وہ زبان سے تو بولتا نہیں، اس کے لئے ترجمان کی ضرورت ہے۔ انسان وہ ہوتے ہیں جو اس کی ترجمانی کرتے ہیں اور جب ان لوگوں نے ہم کو دعوت دی کہ ہم قرآن کو حکم قرار دیں تو ہم ایسی جماعت نہیں بنے کہ جو قرآن سے روگردانی والی ہو۔(خطبہ ۱۲۳)

چوتھے موقع پر ایک کلام کے ضمن میں ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا حُكِّمَ الْحَكَمَانِ لِيُحْيِيَا مَا أَحْيَا الْقُرْآنُ، وَيُمِيتَا مَا أَمَاتَ الْقُرْآنُ، وَإِحْيَاؤُهُ الاجْتِمَاعُ عَلَيْهِ، وَإِمَاتَتُهُ

الافْتِرَاقُ عَنْهُ، فَإِنْ جَرَّنَا الْقُرْآنُ إِلَيْهِمْ اتَّبَعْنَاهُمْ، وَإِنْ جَرَّهُمْ إِلَيْنَا اتَّبَعُونَا.

دونوں حکم اس لئے مقرر ہوئے تھے کہ وہ زندہ کریں اس بات کو جسے قرآن زندہ کرے اور مردہ کریں اس بات کو جسے قرآن مردہ کرے قرآن کی بات کو زندہ کرنے کے معنی اس پر متفق ہونا ہے اور اسے مردہ کرنا اس سے الگ ہونا تو اگر قرآن ہمیں کھینچے ان کی طرف تو ہم ان کے سامنے گردن جھکالیں اور اگر انہیں کھینچے ہماری طرف تو وہ ہمارے سامنے سر جھکا دیں۔(خطبہ ۱۲۵)

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

كِتَابُ اللهِ بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ، نَاطِقٌ لَا يَعْيَا لِسَانُهُ، وَبَيْتٌ لَا تُهْدَمُ أَرْكَانُهُ، وَعِزٌّ لَا تُهْزَمُ أَعْوَانُهُ.

اللہ کی کتاب تمہارے درمیان موجود ہے یہ وہ بات کرنے والا ہے جس کی زبان تھکنے والی نہیں اور وہ عمارت ہے جس کے ستون گرنے والے نہیں اور وہ مرکز عزت ہے جس کے حمایتی شکست کھانے والے نہیں۔(خطبہ ۱۳۱)

ایک اور موقع پر ہے:

إِنَّهُ سَيَأْتِي عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِي زَمَانٌ لَيْسَ فِيهِ شَيْءٌ أَخْفَى مِنَ الْحَقِّ، وَلَا أَظْهَرَ مِنَ الْبَاطِلِ، وَلَا أَكْثَرَ مِنَ الْكَذِبِ عَلَى اللهِ وَرَسُولِهِ، وَلَيْسَ عِنْدَ أَهْلِ ذٰلِكَ الزَّمَانِ سِلْعَةٌ أَبْوَرَ مِنَ الْكِتَابِ إِذَا تُلِيَ حَقَّ تِلَاوَتِهِ، وَلَا أَنْفَقَ مِنْهُ إِذَا حُرِّفَ

عَنْ مَوَاضِعِهِ، وَلَا فِي الْبِلَادِ شَيْءٌ أَنْكَرَ مِنَ الْمَعْرُوفِ، وَلَا
أَعْرَفَ مِنَ الْمُنْكَرِ فَقَدْ نَبَذَ الْكِتَابَ حَمَلَتُهُ، وَتَنَاسَاهُ
حَفَظَتُهُ: فَالْكِتَابُ يَوْمَئِذٍ وَأَهْلُهُ مَنْفِيَّانِ طَرِيدَانِ،
وَصَاحِبَانِ مُصْطَحِبَانِ فِي طَرِيقٍ وَاحِدٍ لَا يُؤْوِيهِمَا مُؤْوٍ:
فَالْكِتَابُ وَأَهْلُهُ فِي ذٰلِكَ الزَّمَانِ فِي النَّاسِ وَلَيْسَا فِيهِمْ،
وَمَعَهُمْ وَلَيْسَا مَعَهُمْ! لِأَنَّ الضَّلَالَةَ لَا تُوَافِقُ الْهُدَى،
وَإِنِ اجْتَمَعَا، فَاجْتَمَعَ الْقَوْمُ عَلَى الْفُرْقَةِ، وَافْتَرَقُوا عَنِ
الْجَمَاعَةِ، كَأَنَّهُمْ أَئِمَّةُ الْكِتَابِ وَلَيْسَ الْكِتَابُ إِمَامَهُمْ،
فَلَمْ يَبْقَ عِنْدَهُمْ مِنْهُ إِلَّا اسْمُهُ، وَلَا يَعْرِفُونَ إِلَّا خَطَّهُ
وَزَبْرَهُ،

یقیناً میرے بعد ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں کوئی شے حق سے زیادہ مخفی
اور باطل سے زیادہ ظاہر نہ ہوگی اور اللہ اور اس کے پیغمبر پر جھوٹ باندھنے
سے زیادہ کوئی چیز نہ ہوگی اور اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ
کوئی چیز بے قیمت نہ ہوگی جب اسے ٹھیک (صحیح مفہوم کے ساتھ) پڑھا
جائے اور اس سے زیادہ کوئی چیز چالو نہ ہوگی جب کہ اس کا بے محل استعمال
کیا جائے اور دنیا میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی
نہ ہوگی تو قرآن کو اس کے حامل افراد نے پس پشت ڈال دیا ہوگا اور اس
کے حافظوں نے اسے بھلا دیا ہوگا تو اس دن قرآن سے سچے اہل قرآن
شہر بدر ہوں گے، وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے ایک ہی راہ

میں کہ ان دونوں کو کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا، تو قرآن اور اس کے والے
اس دور میں آدمیوں میں ہوں گے اور پھر بھی ان میں نہ ہوں گے اور ان
کے ساتھ نہ ہوں گے اس لئے کہ گمراہی ہدایت کے موافق نہیں ہوا کرتی
چاہے ایک جگہ پر دونوں ہوں تو لوگ افتراق پر متحد اور نقطہ اجتماع سے
منتشر ہوں گے۔

گویا وہ خود قرآن کے پیشوا ہیں اور قرآن اُن کا پیشوا نہیں ہے تو اُن کے
پاس قرآن کا صرف نام باقی ہوگا اور وہ بس اس کے خطوطِ تحریری اور نقوشِ مکتوبی کو
پہچانتے ہوں گے۔ (خطبہ ۱۴۵)

ایک کلام کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

وَعَلَيْكُمْ بِكِتَابِ اللهِ، فَإِنَّهُ الْحَبْلُ الْمَتِينُ، وَالنُّورُ
الْمُبِينُ، وَالشِّفَاءُ النَّافِعُ، وَالرِّيُّ النَّاقِعُ، وَالْعِصْمَةُ
لِلْمُتَمَسِّكِ، وَالنَّجَاةُ لِلْمُتَعَلِّقِ، لَا يَعْوَجُّ فَيُقَامَ، وَلَا يَزِيغُ
فَيُسْتَعْتَبَ، وَلَا تُخْلِقُهُ كَثْرَةُ الرَّدِّ، وَوُلُوجُ السَّمْعِ، مَنْ قَالَ
بِهِ صَدَقَ، وَمَنْ عَمِلَ بِهِ سَبَقَ.

دیکھو کتاب خدا پر عمل کرتے رہو اس لئے کہ یہ ریسمانِ محکم، ضیائے روشن،
فائدہ پہنچانے والی دوا اور سیرابی کا سامان اور دامن تھام لینے والے کے
لئے ذریعہ حفاظت اور وابستہ ہو جانے والے کے لئے نجات کا وسیلہ ہے وہ
کبھی کج ہونے والا نہیں کہ اس کو سیدھا کرنے کی ضرورت ہوا اور نہ وہ صحیح
راستہ سے مڑنے والا ہے کہ اسے پلٹانا پڑے بار بار پڑھنا اور گوش زد
ہوتے رہنا اس کو کہنہ نہیں کرتا جو اس کے موافق بات کہے وہ سچا ہی ہوگا اور

جو اس پر عمل کرے وہ بازی مار لے گا۔ (خطبہ ۱۵۴)

ایک خطبہ میں ہے:

وَاسْتَتِمُّوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ بِالصَّبْرِ عَلَى طَاعَةِ اللهِ وَالْمُحَافَظَةِ عَلَى مَا اسْتَحْفَظَكُمْ مِنْ كِتَابِهِ.

اللہ کے فضل و کرم کو اپنے اوپر مکمل کراؤ اطاعت الٰہی کے راستے پر قائم رہنے کے ساتھ اور جس کتاب کی حفاظت کے تم ذمہ دار بنائے گئے ہو اسے پورے طور پر محفوظ رکھنے کے ساتھ۔ (خطبہ ۱۷۱)

ایک مقام پر:

وَاعْلَمُوا اَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ هُوَ النَّاصِحُ الَّذِي لَا يَغُشُّ، وَالْهَادِي الَّذِي لَا يُضِلُّ، وَالْمُحَدِّثُ الَّذِي لَا يَكْذِبُ، وَمَا جَالَسَ هٰذَا الْقُرْآنَ اَحَدٌ اِلاَّ قَامَ عَنْهُ بِزِيَادَةٍ اَوْ نُقْصَانٍ: زِيَادَةٍ فِي هُدًى، اَوْ نُقْصَانٍ مِنْ عَمًى؛ وَاعْلَمُوا اَنَّهُ لَيْسَ عَلَى اَحَدٍ بَعْدَ الْقُرْآنِ مِنْ فَاقَةٍ، وَلَا لِاَحَدٍ قَبْلَ الْقُرْآنِ مِنْ غِنًى؛ فَاسْتَشْفُوهُ مِنْ اَدْوَائِكُمْ، فَاِنَّ فِيهِ شِفَاءً مِنْ اَكْبَرِ الدَّاءِ، وَهُوَ الْكُفْرُ وَالنِّفَاقُ، وَالْغَيُّ وَالضَّلَالُ، فَاسْأَلُوا اللهَ بِهِ، وَتَوَجَّهُوا اِلَيْهِ بِحُبِّهِ، وَلَا تَسْأَلُوا بِهِ خَلْقَهُ، اِنَّهُ مَا تَوَجَّهَ الْعِبَادُ اِلَى اللهِ بِمِثْلِهِ. وَاعْلَمُوا اَنَّهُ شَافِعٌ مُشَفَّعٌ، وَقَائِلٌ مُصَدَّقٌ، وَاَنَّهُ مَنْ شَفَعَ لَهُ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُفِّعَ فِيهِ، وَمَنْ مَحَلَ بِهِ الْقُرْآنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

صُدِّقَ عَلَيْهِ، فَاِنَّهُ يُنَادِي مُنَادٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَلَا اِنَّ كُلَّ حَارِثٍ مُبْتَلًى فِي حَرْثِهِ وَعَاقِبَةِ عَمَلِهِ، غَيْرَ حَرَثَةِ الْقُرْآنِ؛ فَكُونُوا مِنْ حَرَثَتِهِ وَاَتْبَاعِهِ، وَاسْتَدِلُّوهُ عَلَى رَبِّكُمْ، وَاسْتَنْصِحُوهُ عَلَى اَنْفُسِكُمْ، وَاتَّهِمُوا عَلَيْهِ آرَاءَكُمْ، وَاسْتَغِشُّوا فِيهِ اَهْوَاءَكُمْ.

یقین جانو کہ یہ قرآن وہ خیر خواہ ہدایت کرنے والا ہے جس سے دھوکے کا خطرہ نہیں اور وہ رہنما ہے جس سے گمراہی کا اندیشہ نہیں اور وہ باتیں کرنے والا ہے جس کے یہاں جھوٹ کا گزر نہیں کوئی اس قرآن کا ہمدم نہیں بنا مگر اس میں زیادتی پیدا ہوئی یا کمی زیادتی ہدایت میں یا کمی جہالت کے اندھے پن میں اور یقین جانو کہ قرآن کے ساتھ کسی کو احتیاج باقی نہیں رہتی اور بغیر قرآن کے استغنا نہیں ہوتا تو اسے تم اپنے دردوں کی دوا بناؤ اور اپنی مصیبت کے وقت اس سے مدد لو اس لئے کہ اس میں سب سے بڑے مرض کی دوا ہو اور وہ کفر و نفاق، کور باطنی و گمراہی ہے تو اس قرآن کے ذریعہ سے اللہ سے سوال کرو اور اس کی محبت کے ساتھ اس کی طرف رخ کرو اور اس کے ذریعہ اس کی مخلوق سے سوال نہ کرو اور اس کی ایسی کوئی دوسری چیز نہیں جس کے ساتھ اللہ کی طرف رخ کیا جائے اور یقین جانو کہ وہ شفاعت کرنے والا ہے اور اس کی شفاعت مقبول ہے اور وہ کہنے والا ہے اور اس کی بات باور کی جانے والی ہے اور جس کی سفارش روز قیامت قرآن کردے اس کے سہارے اس کی سفارش منظور ہو گی اور جس کا شکایت روز قیامت قرآن کردے تو اس کے خلاف اس کا شکایت سنی جائے

گی تو قیامت کے دن آواز دی جائے گی کہ ہر کاشتکار آج اپنی کاشت کے حساب میں مبتلا ہوگا۔ سوا قرآن کی کاشت کرنے والوں کے تو کیوں نہ تم لوگ اس کی کاشت کرنے والے ہو اور اسی کی پیروی کرنے والے بنو اور اسے اپنے پروردگار کی طرف رہنما بناؤ اور اپنے نفوس کے خلاف اس کی نصیحتوں کو قبول کرو اور اس (کے مطالب) میں اپنے ذاتی خیالات پر بے اعتمادی کرو اپنی نفسانی خواہشوں کو اس میں غلط سمجھو۔ (خطبہ ۱۷۴)

سابق کے ایک خطبہ میں آئندہ زمانہ کے متعلق دنیا والوں کی جو تصویر کشی کی گئی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ دیندار افراد اپنے طرز عمل کی خود جانچ کرتے رہیں کہ وہ تو اس راہ پر نہیں جا رہے ہیں جس کی خبر دی گئی تھی اور جس سے ڈرایا گیا تھا۔

اس کے آخر میں یہ جملہ کہ کتاب و اہل کتاب اس وقت لوگوں کے درمیان موجود ہوں گے مگر نہیں اس لئے کہ ہدایت اور گمراہی ایک نقطہ پر اکٹھا نہیں ہوتی، اس سے اسی قرآن کو جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، حقانیت پر روشنی پڑتی ہے اور پھر آخر میں یہ فقرہ کہ لَا یَعْرِفُوْنَ اِلَّا خطّہٗ و زبرہٗ وہ بس اس کے خطوط تحریری اور نقوش مکتوبی کو پہچانتے ہوں گے، اس امر کی صریحی دلیل ہے کہ تحریف سے معنوی تراش خراش مراد ہے۔ الفاظ قرآن بالکل محفوظ ہوں گے۔

یہ ہیں حقیقی حافظ قرآن اور سب سے پہلے جامع قرآن حضرت علیؑ بن ابیطالب کے ارشادات جو بین الدفتین موجود و متداول قرآن کی سالمیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہے ہیں۔

دیگر آئمہ اہلبیتؑ کے ارشادات

امیر المومنینؑ کے بعد دوسرے ائمہ معصومین علیہم السلام بھی برابر اس کی تبلیغ فرماتے

رہے جس میں سے چند عناوین کے تحت میں تھوڑے سے ارشادات ذیل میں درج ہیں:

قرآن وحدیث کی صحت کا معیار

یہ احادیث جن میں احادیث کی صحت وعدم صحت کا معیار قرآن مجید کو بتایا گیا ہے۔ خود جوامع حدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ وہ تنہا اس قرآن کے حجت کے لئے دلیل قطعی ہو گئے ہیں ان میں سے پانچ حدیثیں جو اصول کافی میں موجود ہیں حوالہ قرطاس کی جاتی ہیں:

(۱) عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال قال رسول اللہ ﷺ ان علی کل حق حقیقۃً و علیٰ کل صواب نورا فما وافق کتاب اللہ فخذوہ و ما خالف کتاب اللہ فدعوہ.

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول خدا ﷺ نے ارشاد کیا ہر حق کے لئے حقیقت ہے یعنی حق نما علامتیں اور ہر واقعیت کے لئے روشنی ہے تو جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اسے لے لو۔ اور جو چیز کتاب خدا کے خلاف ہو اسے ترک کر دو۔

اس میں اصل حدیث جو بیان ہوئی ہے وہ حضرت پیغمبر خدا ﷺ کی ہے لیکن امامؑ جس وقت اسے بیان فرما رہے ہیں اسوقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہی مرتب شدہ قرآن ہے جو آج ہمارے ہاتھوں میں ہے تو امامؑ کے اس ارشاد رسول ﷺ کو پیش کرنے سے ظاہر ہے کہ اس کا انطباق اس قرآن موجود متداول پر ہے۔

(۲) سائت ابا عبد اللہ علیہ السلام عن اختلاف الحدیث یروی بہ من تثق بہ و من لا تثق بہ قال اذا ورد علیکم حدیث فوجد

تم لم شاهدا من كتاب الله عز و جل او من قول رسول الله والا فالذى جآء كم اولى به.

امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ ہمارے سامنے مختلف احادیث آتی ہیں جن میں سے بعض کے راوی موثق اور بعض کے غیر موثق ہیں اور پھر ان کے مفاد میں اختلاف ہے (ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے) حضرت نے فرمایا جب تمہارے سامنے کوئی حدیث پیش ہو اور اس کا کوئی شاہد کتاب خدا یا کسی مستند ارشاد رسولؐ میں موجود تو اس پر عمل کرو ورنہ جو شخص اس روایت کو نقل کر رہا ہے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے یعنی اسے اس کی طرف واپس کردو۔

(۳) عن ایوب بن الحر قال سمعت اباعبدالله علیه السلام یقول کل شیءٍ مردود الی الکتاب و السنة و کل حدیث لا یوافق کتاب الله فهو زخرف.

ایوب بن الحر کہتے ہیں کہ میں نے ابوعبداللہ (امام جعفر صادق علیہ السلام) سے سنا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے

(۴) عن ایوب بن راشد عن اباعبدالله علیه السلام قال مالم یوافق من الحدیث القرآن فهو زخرف.

ایوب بن راشد کہتے ہیں کہ ابوعبداللہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ ہر شے میں کتاب وسنت کی طرف رجوع لازم ہے اور جو حدیث کتاب خدا کے موافق نہ ہو وہ بناوٹی ہے۔

(۵) عن هشام بن الحکم و غیره عن ابی عبدالله علیه السلام قال خطب النبی ﷺ فقال ایها الناس! ما جاء کم یوافق کتاب الله فانا قلته وما جاء کم یخالف کتاب الله فلم اقله.

ہشام بن الحکم وغیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حضرت رسول ﷺ نے منیٰ میں خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں کہا کہ جو حدیث تمہارے سامنے ایسی پیش ہو کہ وہ کتاب خدا کے موافق ہے تو وہ میرا قول ہے اور جو ایسی حدیث ہو کہ کتاب خدا کے مخالف ہو وہ میرا قول نہیں ہے

کافی کے علاوہ دوسرے کتب احادیث میں ایسی ہی حدیثیں اس سے زیادہ موجود ہیں اور سب کا متفقہ مطلب یہ ہے کہ قرآن احادیث کی جانچ کا معیار ہے۔

قرآن کی مخالفت کفر

عن ابی عمر عن بعض اصحابه قال سمعت اباعبدالله علیه السلام یقول من خالف کتاب الله وسنّة محمد ﷺ فقد کفر.

ابی عمر وغیرہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص کتاب الٰہی اور سنت رسالت مآب ﷺ کی مخالفت کرے وہ کافر ہے۔

قرآن نشان ہدایت

(۱) عن طلحه بن زید عن ابی عبداللہ علیہ السلام قال انّ هذا القرآن فیه منار الهدیٰ و مصابیح الدجی فلیجل جال بصره و یفتح للضیاء نظره فان التفکر حیوة قلب البصیر کما یمشی المستنیر فی الظلمات بالنور.

طلحہ بن زید سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا بلا شبہ یہ قرآن (یعنی یہی جو تمہارے ہاتھوں میں ہے) اس میں نشان ہیں ہدایت کے اور چراغ ہیں تاریکی شب کے جسے منظور ہو وہ اس سے اپنی بصیرت کو جلا دے اور اس کی روشنی کے لئے اپنی آنکھ کھولے کیوں کہ غور وفکر صاحب بصیرت کے دل کی زندگی ہے جس طرح روشنی سے انسان تاریکی میں رات قطع کرتا ہے۔

(۲) عن ابی جمیله قال قال اباعبداللہ علیہ السلام کان فی وصیة امیر المومنین علیہ السلام اصحابه اعلموا انّ القرآن هدی النهار و نور اللیل المظلم علی ما کان من جهد و فاقه.

ابی جمیلہ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ امیر المومنینؑ اپنے اصحاب کو تاکید کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ قرآن دن کا رہنما اور شب تاریک کا نور ہے جو سخت ترین ضرورت کے موقع پر کارآمد ہے۔

قرآن جنت کا رہنما اور جہنم سے سد راہ

عن ابی بصیر قال سمعت اباعبداللہ علیہ السلام یقول، ان القرآن زاجر وآمر یأمر بالجنة ویزجر عن النار.

ابی بصیر سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن روکنے والا اور حکم دینے والا ہے۔ حکم دیتا ہے جنت میں جانے کا روکتا ہے جہنم سے۔

اس کے علاوہ: تلاوت قرآن کے فضائل، حامل قرآن کا درجہ، حفظ قرآن کا ثواب، تعلیم قرآن کی اہمیت، تدبر فی القرآن کا حکم۔ یہ وہ ابواب ہیں جن میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں اور اصول کافی کا آخری حصہ ان احادیث سے مملو ہے۔ پھر وہ مقامات ہیں جہاں ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے لئے آیات قرآن سے استدلال کر کے علمائے دین کو ظواہر قرآن سے استفادہ احکام کا سبق دیا ہے۔

اس کے علاوہ امام جعفر صادق علیہ السلام اور دیگر ائمہ معصومینؑ نے امام ابوحنیفہ اور دوسرے فقہائے جمہور کو جب ان کے اجتہادی ماخذوں کی کمزوری پر متنبہ کیا تو یہ فرمایا کہ تم محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، تنزیل و تاویل کا علم نہیں رکھتے لیکن کبھی یہ نہیں کہا گیا یہ قرآن محرّف ہے اس لئے اس سے استفادہ احکام درست نہیں ہے۔

فقہ جعفری کے احکام متعلقہ قرآن

یہ فقہ جس پر شیعوں کا عمل ہے ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے جو جمہور امت میں فقۂ جعفری کے نام سے موسوم ہوگئی ہے۔ اس کے تمام احکام بھی اسی ''بین الدفتین'' کتاب سے متعلق ہیں جو ہمارے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

دیکھئے فقہ کی کتابیں: خط مصحف کو بغیر طہارت چھونا حرام اور حواشی و بین السطور کا چھونا بھی مکروہ سجدہ والے سوروں کا جنب وغیرہ کے لئے پڑھنا حرام ہے اور دوسرے سوروں کی سات آیتوں سے زیادہ کا پڑھنا مکروہ۔ کافر کے ہاتھ قرآن کا ہدیہ کرنا حرام اور کافر کی ملکیت قرآن کے لئے ناجائز موجودہ قرآن کے علاوہ کسی بھی جزء کا بحیثیت قرآن نماز میں پڑھنا حرام نجاست کا قرآن تک پہنچانا گناہ عظیم اور احکام شرعیہ کہ ادلہ اربعہ میں قرآن کا پہلا درجہ ان تمام مقامات پر اور اس کے علاوہ جہاں بھی کسی شیعی عالم کے کلام میں قرآن کا نام آتا ہے اس سب سے مراد یہی قرآن ہوتا ہے جو سب کے سامنے موجود ہے۔

تفسیر اور دیگر علوم قرآن کے بارے میں آئمہ اہلبیتؑ اور پھر ہر صدی کے علمائے شیعہ کی خدمات

سب سے پہلے تو امیر المومنینؑ کا جو جمع کردہ قرآن تھا اس میں صرف متن قرآن نہ تھا بلکہ الفاظ قرآن کے وہ تشریحات بھی تھے جو حضرت پیغمبرؐ خدا پر منزل من اللہ تھے اور جن کو ائمہ اہلبیتؑ کے احادیث میں تنزیل قرآن یعنی قرآن کے معنی تنزیل کیا گیا ہے چناں چہ احتجاج طبرسیؒ میں اس کے لئے خود حضرت امیر علیہ السلام کا ارشاد درج ہے کہ:

ولقد جئتهم بالكتاب كملا مشتملا على التنزيل والتأويل

میں نے ان کے سامنے پورا قرآن پیش کیا جو تنزیل اور تاویل دونوں پر حاوی تھا۔

اسی لئے اس کے متعلق محمد بن سیرین کا قول تھا:

لو اصيب ذالك الكتاب كان فيه العلم۔

(تاریخ الخلفاء۔ص ۱۸۴)

اگر وہ کتاب لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو ایک بڑا علمی ذخیرہ اس میں ہوتا۔

اس کے علاوہ آپ نے اقسام علوم قرآن اور ان کے امثلہ کو بسط و تشریح کے ساتھ یکجا محفوظ کیا۔ چنانچہ شیخ جلیل ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن جعفر نعمانی کی کتاب جو تفسیر نعمانی کے نام سے مشہور ہے اسی ایک حدیث پر مشتمل ہے جو امیر المومنینؑ سے منقول ہے

اوراس میں حضرت نے آیات قرآن کی ساٹھ قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کی ایک مثال ذکر فرمائی اوراس کی تفسیر ارشاد فرمائی۔

سید مرتضیٰ علم الہدیٰ نے اس کتاب کا خلاصہ تحریر فرمایا جو شیخ حر عاملی تک پہنچا تھا اورانہوں نے وسائل الشیعہ میں احکام فقہیہ کے متعلق مضامین کواس سے اخذ کیا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار کی اس جلد میں جو قرآن مجید سے متعلق ہے ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ:

باب ما ورد عن امیر المومنین علیہ السلام فی اصناف آیات القرآن و انواعها و تفسیر بعض آیاتها بروایة نعمانی هی رسالة مفردة مدونته کثیرة الفوائد نذکرها من فاتحتها الی خاتمتها.

اس باب میں امرالمومنینؑ کی وہ حدیث ہے جو آیات قرآن کے اقسام اور ان میں سے بعض آیات کی تفسیر میں نعمانی کی روایت سے وارد ہوئی ہے اور یہ ایک مستقل تصنیف شدہ رسالہ ہے جو بہت فوائد پر مشتمل ہے ہم اسے شروع سے آخر تک پورا نقل کرتے ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم کی ابتداء میں جو آیات قرآن کے اقسام درج ہیں انہیں بھی جہاں تک دیکھا جائے اس حدیث امیر المومنینؑ کا خلاصہ ہے۔

بہر حال سب سے پہلے علم تفسیر کی تدوین امیر المومنؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

پھر امام محمد باقرؑ نے تفسیر تحریر فرمائی جس کا پتہ ابن ندیم نے فہرست میں دیا ہے اور علم تفسیر کے مصنفات کے ذکر میں لکھا ہے۔

کتاب الباقر محمد بن علی بن الحسین رواه عنه ابو الجار

ود زیاد بن المنذر رئیس الجارودیة الزیدیة

محمد باقر ابن علی بن الحسین علیہم السلام کی کتاب جسے ان سے ابوالجارود زیاد بن المنذر رئیس فرقہ زیدیہ جارودیہ نے نقل کیا۔جیسا کہ ابن ندیم نے لکھا ہے بے شک ابو الجارود ایک زیدی فرقہ کے پیشوا ہو گئے تھے مگر یہ ان کے آخر عمر کی بات ہے جب انہوں نے اس تفسیر کی روایت امام محمد باقر علیہ السلام سے کی ہے تو اس وقت وہ جماعت امامیہ میں داخل تھے چنانچہ ابوبصیر یحییٰ بن قاسم اسدی اور بعض دیگر معتبر رواۃ شیعہ نے اس تفسیر کی ان سے روایت کی اور کتب شیعہ میں تفسیر قرآن کے متعلق جو بہت روایات مذکور ہیں ان کے متعلق یہ خیال کرنا درست ہے کہ وہ اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

اس کے بعد امام حسن عسکری علیہ السلام گیارہویں امام نے تفسیر قرآن میں جو افادیت فرمائی ان سے حسن بن خالد برقی نے ایک سو بیس حصوں پر مشتمل تفسیر مرتب کی۔

یہ اس کتاب کے علاوہ تھی جو تفسیر امام حسن عسکریؑ کے نام سے مشہور ومطبوع ہے لیکن اس کی نسبت حضرتؑ کی طرف درست نہیں ہے۔

یہ تمام علمی کاوشیں اسی قرآن سے متعلّق تھیں جو جمہور اہل اسلام کے ہاتھوں میں موجود ہے۔

اور جب خود ائمہ معصومین علیہم السلام کو اس بارے میں اتنا اہتمام تھا تو اصحاب ائمہؑ جنہیں صدر اول میں علمائے شیعہ کی حیثیت حاصل ہے ان کے بھی تو جہات اس محور پر گردش کرتے رہے چنانچہ اصحاب وتلامذہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام میں سے جن کا نام بحیثیت مفسر بہت نمایاں ہے وہ جناب عبداللہ بن عباس ہیں اگرچہ ان کے نام سے جو تفسیر ''تنویر المقیاس'' مطبوع ومتداول ہے وہ مثل تفسیر امام حسن عسکریؑ کے بے وزن وبے اعتبار ہے۔

ان کے علاوہ امیر المومنینؑ کے تلامذہ با اختصاص میں میثم بن یحییٰ تمار ہیں جنہو

ں نے جناب ابن عباس سے کہا:

اسئلنی ماشئت من تفیسر القران فانی قرات تنزیله علی امیرالمومنین علیہ السلام وعلّمنی تاویله. (رجال کشی)

مجھ سے تفسیر قرآن کے متعلق جو پوچھنا ہو دریافت کر لیجئے اس لئے کہ میں نے قرآن کو تمام وکمال جناب امیرؑ سے حفظ کیا ہے اور انہوں نے مجھ کو اس کی تاویل کی تعلیم دی ہے۔

اور جناب ابن عباس نے ان مضامین کو جو انہوں نے بتلائے قلمبند کیا۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ جناب عبداللہ بن عباس کے شاگردوں کا ہے جو امام زین العابدینؑ کے اصحاب میں سے ہیں جیسے سعید بن جبیر، ابوصالح، میزان البصری اور طاؤس بن کیسان ابوعبداللہ یمانی متوفی ۱۰۶ھ۔

تیسرا طبقہ امام محمد باقر علیہ السلام کے اصحاب کا ہے اس زمانہ میں اہلبیتؑ کے فیوض علمیہ ذرا آشکار طور پر لوگوں کو پہنچ رہے تھے لہٰذا فن تفسیر کو بھی اس زمانہ میں کافی ترقی ہوئی اور حضرت کے متعدد اصحاب بحیثیت مفسر کتب سیر کے صفحات پر نمایاں ہیں مثلاً جابر بن یزید جعفی، عطیہ عوفی، محمد بن حسن بن ابی سارہ روٗسی، سدی کبیر اسمٰعیل بن عبدالرحمن ابومحمد قرشی کوفی۔ ابان بن تغلب محمد بن سائب کلبی اور ابوحمزہ ثمالی ان میں سے متعدد افراد کے تفاسیر کا تذکرہ ابن ندیم نے اپنی مشہور ومعروف فہرست میں کیا ہے۔

اس کے بعد امام جعفر صادقؑ کے اصحاب میں مخّل بن جمیل اسدی کوفی اور وہیب بن حفص ابوعلی ہیں۔ انہوں نے امام موسیٰ کاظمؑ سے بھی احادیث اخذ کی اسی دور کے معلّٰی بن محمد بصری جن کے تصانیف میں کتاب الفہرست بھی ہے۔

ہشام بن سالم، حمزہ بن حبیب، علی بن ابی حمزہ بطائی، حصین بن مخارق ابوجنادہ سلولی، عبداللہ بن عبدالرحمن، المسمعی البصری اور مشہور ماہر کیمیا وریاضی وفلسفہ جابر بن

حیان طرسوسی۔

اس کے بعد امام موسیٰ کاظمؑ کے وہ اصحاب ہیں جنہوں نے حضرت صادقؑ کے زمانہ کو نہیں پایا۔ عیسیٰ بن داؤد النجار کسائی علی بن حمزہ، یونس بن عبدالرحمن، محمد بن خالد برقی حسن بن محبوب ابوعلی مراد۔

پھر وہ طبقہ ہے جو امام رضاؑ اور آپ کے بعد کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جیسے حسن بن علی فضال، دارم بن قبیصہ تمیمی دارمی، مشہور نحوی فراء ابوزکریا، یحییٰ بن زیاد، اقطع کوفی، حسن بن سعید بن حماد کوفی اہوازی اور ان کے چھوٹے بھائی حسین بن سعید، علی بن اسباط کوفی، علی بن معزیار اہوازی، عبداللہ بن صلت ابوطالب قمی، ابوالعباس مبرد اور احمد بن محمد بن عیسیٰ قمی۔

اس کے بعد کا طبقہ: وہ ہے جس نے امام محمد تقیؑ اور آپ کے بعد کے ائمہؑ سے روایت کی ہے ان میں احمد بن محمد بن خالد برقی ہیں۔ محمد بن ارومہ ابوجعفر قمی، علی ابن حسن بن علی بن فضال، حسن بن خالد برقی جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

یہاں سے ائمہ علیہم السلام کے ظہور کا دور ختم اور اصحاب ائمہ علیہ السلام کا سلسلہ قطع ہو جاتا ہے۔ اب وہ علماء ہیں جو ائمہ معصومینؑ کی صحبت سے بہرہ اندوز نہیں ہوئے ان میں بھی ہر دور میں برابر تفسیر قرآن کے مصنفین ہوتے رہے۔

تیسری صدی ہجری کے علماء زمانہ غیبت کے پہلے طبقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں تفسیر قرآن کے مصنفین میں محمد بن ابوالقاسم ابوعبداللہ ماجیلویہ، سعد بن عبداللہ بن ابی خلف اشعری قمی، احمد بن صبیح اسدی، ابراہیم بن محمد بن سعید ثقفی سلمۃ بن الخطاب براد ستانی عیاشی محمد بن مسعود بن محمد بن عیاش سلمٰی سرقندی علی بن ابراہیم قمی فرات بن ابراہیم کوفی، محمد بن علی شلغانی وغیرہ ہیں۔

ان کے بعد وہ طبقہ ہے جو چوتھی صدی ہجری تک باقی تھا ان میں علی بن بابویہ

قمی، عبدالعزیز بن یحییٰ الجلودی، ابوبکر صولی، محمد بن حسن ابن الولید القمی، احمد بن محمد بن حسین بن حسن بن دول قمی اور علی بن احمد ابوالقاسم کوفی وغیرہ تھے۔

چوتھی صدی ہجری کے مخصوص: علماء میں جو تفسیر کے مصنف ہیں شیخ صدوق محمد ابن علی بن بابویہ قمی، محمد بن علی بن عبدک ابوجعفر جرجانی، ابومنصور حرام نیشاپوری، موسیٰ بن اسمعیل، محمد بن ابراہیم بن جعفر کاتب نعمانی، عبدالرحمن بن حسن قاشانی، حسن بن موسیٰؑ نوبختی وغیرہ ہیں۔

پانچویں صدی میں شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان بغدادی، حسین ابن علی بن الحسین ابوالقاسم وزیر مغربی اور پھر شیخ مفید کے تلامذہ سید رضی موسوی جامع نہج البلاغہ اور ان کے بڑے بھائی علم الہدیٰ سید مرتضیٰؒ۔ محمد بن احمد وزیر عمیدی، شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسی، علامہ کراچکی، اسمعیل بن علی بن حسین بن سمان شیخ محمد بن احمد بن علی قتال نیشاپوری محمد بن ابی الخیر ہمدانی وغیرہ ہیں۔

اب چھٹی صدی: شروع ہوجاتی ہے اس میں شیخ ابوالفتوح رازی سید عزالدین علی بن ضیاالدین فضل اللہ الحسنی الراوندی اور امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسی مصنف تفسیر مجمع البیان، قطب الدین راوندی ابن ادریس حلی۔ محمد بن حسین قتال فارسی نیشاپوری اور ابن شہرآشوب مصنف متشابہ القرآن وغیرہ ہیں۔

ساتویں صدی: میں سید احمد بن طاؤس اور علامہ حلیؒ

آٹھویں صدی: میں ملا عبدالرزاق کاشی، شیخ قطب الدین رازی، شیخ مقداد بن عبداللہ سیوری حلی، ابن متوج بحرانی۔

نویں صدی: میں سید بہاءالدین علی بن سید غیاث الدین عبدالکریم حسینی، کمال الدین حسن بن محمد استرآبادی۔

دسویں صدی: میں امیر غیاث الدین منصور حسینی شیرازی، شاہ طاہر دکنی، شہید

ثانی شیخ زین الدین عاملی، ابوالغنائم عبدالرزاق کاشانی، علی بن حسن زواری، محمد بن احمد خواجگی شیرزی، ملا فتح اللہ کاشانی، ملا احمد بن محمد مقدس اردبیلی، ملا خلیل قزوینی شارح اصول کافی اور فیضی جو ہندوستان میں محتاج تعارف نہیں، سید حسین خلخالی اور قاضی نوراللہ شوستری جو شیعان ہند میں شہید ثالث کے لقب سے مشہور ہیں۔ مرزا محمد استرآبادی، سید محمد بن زین العابدین حسینی استرآبادی ان میں سے بعض گیارہویں صدی تک رہے ہیں۔

خاص گیارہویں صدی میں احمد بن زین علوی معزالدین اردستانی، نعمت خان عالی، رضی الدین محمد قزدینی، شیخ بہاءالدین عاملی، میر محمد ہادی حسینی مرعشی سوستری، تاج الدین حسن بن محمد اصفہانی، ملا نظام سادجی، ملا بدیع الزمان ہرمذی اصفہانی، ملا صدار شیرازی، ملا محسن کاشانی صاحب تفسیر صافی، شیخ فخرالدین طریحی، شیخ حسین بن شہاب الدین عاملی، سید شرف الدین علی حسینی استرآبادی، محمد بن محمد محسن الفیض الکاشانی، نورالدین محمد کاشانی، ملا محمد طاہر قمی، سید ہاشم بحرینی، شیخ جواد کاظمی، حسام الدین طریحی، شیخ حسین بن مطر جزائری، عبدعلی بن جمعہ عروسی حویزی، عبدعلی بن رحمہ حویزی، شیخ عبدالقاہر بن حاج عبد بن رجب عبادی حویزی، سید علی خان حویزی، شیخ فرج اللہ حویزی، سید محمد رضا حسینی، احمد بن حسن حر عاملی، محمد حسین بن محمد قمی، محمد مومن سبزواری، امیر محمد طالقانی، شیخ علی بن شیخ حسین کربلائی، مرزا محمد رضا قمی۔

بارہویں صدی: میں سید نعمت اللہ جزائری، محمد صالح خاتون آبادی، محمد اسمعیل خاتون آبادی امیر ابراہیم بن محمد معصوم قزوینی، شیخ سلیمان بن عبداللہ بحرینی، محمد بن عبد الفتاح سراب تنکاینی، شیخ عبداللہ بحرینی، ملا عبداللہ مجلسی، میرزا عبداللہ آفندی مصنف ریاض العلماء سید نورالدین ابن سید نعمت اللہ جزائری، سید عبداللہ بن سید نورالدین شوستری، سید بہاءالدین محمد بن محمد باقر حسینی مختاری نائینی فاضل ہندی بہاءالدین محمد تاج الدین اصفہانی، سید محمد حیدر موسوی عاملی، ابوالحسن شریف فنونی عاملی شیخ احمد جزائری، محمد

اسمٰعیل مازندرانی، شیخ محمد رضا ہمدانی، سلطان محمد بن حیدر بن محمد جنابذی شیخ علی حزیںؔ سلیمان جرجی۔

اس کے بعد تیرہویں صدی ہے جس کا آغاز سے جناب غفرآن مآب طاب ثراہ کے قیام لکھنؤ نے لکھنو کو شیعہ علمی مراکز کی حیثیت دی آپ کے تلامذہ میں سے مولوی یاد علی صاحب نصیر آبادی نے فارسی میں تفسیر لکھی جو دو جلدوں میں ہے اور اسی دور میں میرزا محمد اخباری نے تفسیر لکھی اور جناب غفرآن مآب کے فرزند سید سید علی نے اردو زبان کی سب سے پہلی تفسیر تحریر کی۔

ان کے علاوہ ہندوستان اور ایران اور عراق میں جن لوگوں نے مکمل تفسیرین لکھیں یا کسی ایک شعبۂ تفسیر میں کام کیا، وہ حسب ذیل ہیں

سید عبداللہ شبر کاظمی، حاج میرزا لطف علی بن میرزا احمد تبریزی اخوند ملا مہر علی تبریزی خوئی، حاج ملا عبدالوہاب قزوینی جناب غفرآن مآب کے چھوٹے فرزند سید العلماء مولانا سید حسین اور شاگرد مفتی سید محمد قلی کنتوری اور سید العلماء کے فرزند ممتاز العلماء مولانا سید محمد تقی صاحب تفسیر ینابیع الانواز، آقا محمد حسین باشتہ طلائی، سید رجب علی خاں جگرانوی، ملا علی قاریوز آبادی حاج محمد نجف کرمانی، حاج محمد صالح برغنانی، محمد بن سلیمان تنکانی، ملا حسن علی تولسیر کانی، ملا محمد تقی ہروی حائری، سید مہدی قزوینی، حاج ملا رضا ہمدانی، ملا سلطان گون آبادی ہمارے جدامجد فردوس مکان الحاج سید محمد ابراہیم، شیخ محمود چشتی عراقی، تاج العلماء مولانا سید علی محمد، مولوی عمار علی پانی پتی، شیخ محمد حسین اصفہانی نجفی، حاج میرزا محمد علی قراجہ داغی محقق شہرستانی حاج میرزا محمد حسین حائری، شیخ حسن شہرودی تبریزی، مولانا ابوالقاسم قمی لاہوری صاحب تفسیر **لوامع التنزیل** اب ہماری چودھویں صدی آگئی ہے اس میں ہندوستان میں جنہوں نے ہم سے پہلے تفسیر کے سلسلہ میں کام کیا شمس العلماء مولانا سید علی حائری۔ مولانا سید محمد محسن زنگی پوری، مولانا سید احمد حسین امرد ہوی، مولانا

اعجاز حسین امروہوی، حافظ فرمان علی صاحب مترجم قرآن، مولانا محمد ہارون زنگی پوری، مولانا مقبول احمد صاحب دہلوی، مولانا سید راحت حسین صاحب گوپال پوری مولانا سید محمد رضی صاحب زنگی پوری۔

ایران میں ملا حسین سجاسی مقیم زنجان، اخوند ملا حسیب اللہ کاشانی، اخوند ملا محمد تقی کاشانی، شیخ محمد حسین شیرازی، سید محمد رضا حسینی کاشانی پشت مشہدی، آقا حسین نجم۔ آبادی طہرانی، شیخ علی اصغر بیرجندی، شیخ محمد باقر بیرجندی اور شیخ محمد نہاوندی اور ہمارے دور کے علامہ سید محمد حسین طباطبائی۔

عراق میں شیخ مرتضیٰ نظام الدین حلّی کاظمینی، آقا فتح علی زنجانی، سید علی طباطبائی یزدی حائری، سید عبدالحسین حسینی آل کمونہ نجفی اور ہمارے دور کے مجاہد قلمی اکبر شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ صاحب تفسیر آلاء الرحمن آقا میرزا ہادی خراسانی مجتہد کربلائے معلیٰ، شیخ محمد اشکوری نجفی اور اب عصر حاضر کے مرجع خلائق استاد علام الحاج سید ابوالقاسم خوئی دام ظلہ۔

ظاہر ہے کہ یہ طبقات مفسرین شیعہ پر کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ یہ تو سرسری جو نام ہر صدی کے پیش نظر تھے ان کی ایک مجمل فہرست ہے جو ایک منصف مزاج یا غیر جانبدار صاحب عقل کو یہ احساس پیدا کرنے کیلئے قطعی کافی ہے کہ چودہ صدی کے قریب طویل دور زمانہ کے ہر جزء میں اتنے علماء افاضل اور اہل قلم کی دماغی طاقتیں، صلاحیتیں اور وقت پوری جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ ایک ایسی چیز پر صرف نہیں ہو سکتے جسے وہ دینی حیثیت سے کوئی اہمیت (معاذ اللہ) نہ دیتے ہوں۔ ایسا تصور یا بس کوئی انتہائی متعصب کر سکتا ہے یا دیوانہ۔

علماء شیعہ کی یہ مسلسل کاوشیں جو بین الدفتین موجود ہیں اسی کتاب سے متعلق ان کی نظر میں اس کی دینی اہمیت کا قطعی ثبوت ہیں۔

نفی تحریف کے متعلق علماء شیعہ کے تصریحات

گذشتہ دلائل وشواہد کے بعد ضرورت تو باقی نہیں رہتی پھر بھی ذیل میں مختلف ادوار زمانہ کے چند اکابر علماء کے تصریحات بھی اس بارے میں درج کر کے اس تبصرہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

(۱) راس المحدثین شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی جن کی کتاب ''من لا یحضرہ الفقیہ'' شیعوں کے کتب اربعہ میں داخل ہے، اپنے ''اعتقادات'' میں تحریر فرماتے ہیں:

اعتقادنا ان القراٰن الذی انزل اللہ تعالٰی علی نبیہ محمد ﷺ ھو ما بین الدفتین ھو ما فی ایدی الناس لیس باکثر من ذالك. و من نسب الینا انا نقول انہ اکثر من ذالك فھو کاذب.

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جس کو اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے جو دونوں دفتیوں کے درمیان ہے اور لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہ تھا اور جو شخص ہماری طرف اس قول کی نسبت دے کہ وہ اس سے زیادہ تھا، وہ جھوٹا ہے۔

(۲) جناب سید مرتضیٰ علم الہدی رحمۃ اللہ علیہ نے مسائل طرابلسیہ میں تحریف قرآن کا انکار کیا ہے یہ کتاب ہمارے سامنے نہیں ہے مگر ان کا یہ قول ان کے شاگرد جناب شیخ طوسی نے تبیان میں اور علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں درج کیا ہے۔

(۳) شیخ الطائفہ محمد بن الحسن الطوسیؒ اپنی عظیم الشان تفسیر ''تبیان'' میں

تحریر فرماتے ہیں:

اما الکلام فی زیادتہ و نقصانہ فمما لا یلیق بہ لان الزیادۃ فیہ مجمع علی بطلانہ و النقصان منہ فالظاھر ایضًا من مذھب المسلمین خلافہ و ھو الالیق بالصحیح من مذھبنا کما نصرہ المرتضی وھو الظاھر من الروایات.

قرآن میں زیادتی وکمی کی گفتگو اس کی شان کے خلاف ہے اس لئے کہ زیادتی کے بطلان پر تو اجماع ہے اور کمی کے متعلق عموماً مسلمانوں کے مذہب کو ظاہر کیا ہے کہ اسکا تصور غلط ہے اور ہماری جماعت کا بھی صحیح طور پر مذہب یہی کہا جا سکتا ہے جس کو سید مرتضیٰ نے تقویت دی ہے اور وہ ائمہؑ کے روایات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

(۴) امین الاسلام شیخ ابوعلی طبرسیؒ ''تفسیر'' مجمع البیان میں لکھتے ہیں:

اما الزیادۃ فیہ فمجمع علی بطلانہ واما النقصان فیہ فقد روی جماعۃ من اصحابنا و قوم من حشویۃ العامۃ ان فی القراٰن تغیرا و نقصانا و الصحیح من مذھب اصحابنا خلافہ و ھو الذی نصرہ المرتضی قدس اللہ روحہ.

قرآن میں زیادتی کا ہونا تو باجماع باطل ہے اور کمی کے متعلق کچھ شیعہ اور سنی ظاہر بین محدثین نے روایات نقل کی ہیں کہ اس قرآن میں کچھ تغیر وتبدیل اور نقصان ہوا ہے لیکن ہمارے علماء میں جو صحیح مذہب ہے وہ اس کے خلاف ہے اور یہی وہ ہے جسے جناب سید مرتضیٰ قدس اللہ روحہ، نے ثابت کیا ہے۔

(۵) فاضل تونی ملا عبداللہ بشرینی خراسانی شرح وافیہ مطبوعہ لکھنؤ ۵۲، ۵۳ میں

لکھتے ہیں:

قد وقع الخلاف فی تغیرہ فقیل ان فی زیادۃ و نقصانا و بہ روایات کثیرۃ رواھا الکلینی علی بن ابراھیم فی تفسیرہ والمشھور أنه محفوظ و مضبوط کما انزل لم یتبدّل و لم یتغیّر حفظه الحکیم الخبیر.

قرآن مجید میں تغیر وتبدیل کے متعلق اختلاف ہوا ہے بعض نے کہا ہے کہ اس میں کچھ کمی اور زیادتی ہوئی ہے اور اس کے متعلق بہت سے روایتیں بھی آئی ہیں جنہیں کلینی اور علی بن ابراہیم نے درج کیا ہے لیکن زیادہ تر علماء کا قول یہ ہے کہ وہ جتنا نازل ہوا تھا اتنا ہی محفوظ وسالم ہے اور اس میں تغیر و تبدیل نہیں ہوا ہے خداوند عالم نے اس کی حفاظت فرمائی ہے۔

(۶) محقق ثانی شیخ علی بن عبدالعالی کرکی مصنف ''جامع المقاصد'' آپ نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی واقع نہ ہونے کے متعلق تحریر فرمایا۔

(۷) علامہ شیخ بہاءالدین عاملی فرماتے ہیں:

اختلفوا فی وقوع الزیادۃ والنقصان فیه والصحیح أن القرآن العظیم محفوظ عن ذالك زیادۃ کان أو نقصانا و یدل علیه قوله تعالیٰ: وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاءالرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرائد معروف بحاشیہ آشتیانی بر رسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں:

المشھور بین المجتھدین الاصولیین بل اکثر المحدثین عدم وقوع التغیر مطلقا بل ادعی غیر واحد الی الاجماع علیٰ ذالك سیّما بالنسبة الی الزیادۃ.

کمی اور زیادتی کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور صحیح یہ ہے کہ قرآن کریم اس سے زیادتی اور کمی دونوں اعتبار سے محفوظ ہے اور اس پر آیت قرآن دلالت کرتی ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔

اس قول کو شیخ جواد بلاغی طاب ثراہ نے آلاءالرحمن میں درج فرمایا ہے۔

(۸) شیخ محمد حسن آشتیانیؒ بحر الفوائد فی شرح الفرائد معروف بحاشیہ آشتیانی بر رسائل مطبوعہ ایران ۹۹ میں لکھتے ہیں: قول مشہور مجتہدین اصولیین بلکہ اکثر اخباری علماء کے درمیان بھی یہ ہے کہ قرآن میں تغیر وتبدیل بالکل نہیں ہوا ہے بلکہ متعدد حضرات نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے خصوصاً زیادتی نہ ہونے کے متعلق۔

(۹) جناب شیخ جعفر نجفی طاب ثراہ اپنی مشہور و معروف کتاب ''کشف الغطاء'' میں تحریر فرماتے ہیں:

لاریب انّه محفوظ من النقصان بحفظ الملك الدّیّان کما دلّ علیه صریح القرآن واجماع العلماء فی کل زمان.

بلاشبہ وہ کمی سے محفوظ ہے خالق کریم کی حفاظت کے سبب سے جس پر قرآن صریحی طور سے دلالت کرتا ہے اور اسی پر ہر زمانہ میں علماء کا اجماع رہا ہے۔

(۱۰) سید محمد مہدی رضوی نے اعتقادیہ صدوقؒ کی شرح فارسی میں لکھی ہے جس کا سال تصنیف ۱۲۶۱ھ ہے اس کا قلمی نسخہ ہماری نظر سے گزر رہا ہے اس میں ۶۵ پر ہے:

”فصل بست و نہم در بیان آنکه قرآن کلام حق تعالیٰ وحی فرستادہ اوست“

اس کے ذیل میں لکھا ہے:

خداوندنگاہ درانده است از زیادہ ونقصان وانعدام: آن از میان مردمان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر ہے۔

”فصل سیم اعتقاد درباب مبلغ قرآن و منزل مجموع آن شیخ مہرور روح اللّٰہ روحہ می فرماید کہ اعقاد ما آنست کہ قرآن کہ حق تعالیٰ آں را بر پیغمبر خود محمد رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرستادہ ہمانست کہ مکتوب و مرقوم شده و جمع درمجلہ گشتہ در دست مرد مانست و زیادہ برین نیست و ہرکہ نسبت دہد بما طائفہ امامیہ اثناء عشریہ کہ میگوئم قرآن زیادہ بریں است دروغ گفتہ وغیرہ واقعی بما استناد کردہ و آن کہ مردیست از ثواب ختم مجموع آن و جائز نمودن خواندن زیادہ از یک سورہ دریک رکعت فریضہ مصدق آنست کہ ما بیان ان نمودیم کہ قرآن زیادہ ازین نیست کہ در دست خلائق است وہمچنیں مردیست۔

درباب نہی از خواند ن تمام قرآن دریک شب وآں کہ جائز نیست ختم تمام قرآن درمدت کمتر از سہ روز نیز مصدق آنست کہ ما بیا نمودیم درباب آن کہ قرآن زیادہ بریں نیست۔“

(۱۱) ہمارے دور کے بہت بڑے محقق مجتہد مجاہد علامہ شیخ محمد جواد بلاغیؒ نے اپنی کتاب آل ء الرحمن فی تفسیر القرآن“ جلد ۱ مطبوعہ مطبع ”العرفان“ صیدا میں پہلے توصفحہ نمبر ۱۸ پر جمع قرآن کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے۔

فلم یتفق لامر تاریخی من التواتر و بداهة البقاء مثل ما اتفق للقرٰان الکریم کما وعد اللہ جلّت اٰلاوہ بقوله سورۃ الحجر: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ. و قوله

فی سورۃ القیامۃ: اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ. ولمن سمعت فی الروایات الشاذۃ شیئا فی تحریف القرٰان وضیاع بعضه فلا تقم لتلك الروایات وزنا.

کسی تاریخی بات کو یہ تواتر نصیب نہیں ہوا اور بدیہی طور پر باقی ہونے کا ثبوت جیسا قرآن مجید کے لئے حاصل ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا۔ سورہ حجر کی آیت میں ہے کہ ”ہم نے اس قرآن کہ اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کریں گے“ اور سورہ قیامت میں کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا یکجا کرنا اور اس کا برابر پڑھتے جاتے رہنا اور اگر شاذ روایت میں کوئی ایسی بات سنو جس سے قرآن میں کچھ تغیر و تبدیل کا ذکر ہو یا یہ کہ اس کا کوئی حصہ تلف ہوگیا تو ان رویات کا کوئی وزن نہ سمجھو۔ اس کے بعد ۲۵ پر مستقل عنوان قائم کیا ہے:

قول الامامیۃ بعدم النقصیۃ فی القران

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

پھر اس ذیل میں صدوقؒ اور ان کے بعد والے علماء کے ارشادات نقل کئے ہیں اور جن روایات سے تحریف کا توہم ہوتا ہے ان کی سند و دلالت پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ توہم درست نہیں ہے۔ ان ارشادات کو آخر کتاب میں افادات بلاغی کے تحت میں درج کیا جائے گا۔

(۱۲) ماضی قریب کے سب سے بڑے مشہور و معروف مرجع تقلید آقا سید محسن حکیم طباطبائی علیہ الرحمہ کی نگرانی میں ایک نصاب دینیات کا سلسلہ طلاب مدارس کے لئے الاسلام دین وحیاۃ کے نام سے علامہ سید موسیٰؑ صدر کا تحریر کردہ شائع ہوا ہے جو ۱۹۶۶ء میں بیروت میں طبع ہوا ہے اور کے چھٹے حصہ میں صفحہ نمبر ۱۵ پر ہے۔

القرآن الذی بین ایدینا الآن ھو نفس القرآن الذی انزلہ اللہ علی عبدہ محمد ﷺ و نحن نؤمن بہ و کل ما جاء فیہ و لقد حماہ اللہ من اعدائہ و من المنافقین فلا تغیر فیہ و لا تبدیل و لا زیادۃ و لا نقصان و لم یزد علیہ کلمۃ و لا حروف و لم ینقص منہ کلمۃ و لا حرف و لا یأیتہ الباطل من بین یدیہ و لا من خلفہ۔

قرآن جو ہمارے سامنے موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو اللہ نے اپنے بندہ خاص حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا تھا اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہر اس چیز پر جو اس میں درج ہے اور اللہ نے محفوظ اس کو رکھا ہے اس کے دشمنوں سے اور منافقوں سے تو نہ اس میں تغیر ہے اور نہ تبدیل اور نہ زیادتی اور نہ کمی اور اس میں ایک لفظ اور ایک حرف کی بھی زیادتی نہیں ہوئی ہے اور نہ ایک لفظ اور ایک حرف کی کمی ہوئی ہے اور باطل کا دسترس اس پر کسی بھی رخ سے نہیں ہے۔

(۱۳) زمانہ حال کے ایک مرجع تقلید آیۃ اللہ آقائے سید محمد کاظم شریعتمداری بانی ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم (ایران) اپنے ایک مکتوب میں جو اسلامی شخصیتوں کے نام تحریر فرمایا ہے۔ اور رسالہ ''فعالیتہای در راہِ وحدت اسلام'' مطبوعہ ایران کے ۲ پر درج ہے۔

ان الحجاج الایرانیین القادمین من زیارۃ بیت اللہ الحرام قد جاء ونا بہذہ الرسالۃ و راینا فیہا ما لا یعتقد بہ ای فرد شیعی فی ای مکان کالقول بتحریف القران الکریم العیاذ باللہ۔

صفحہ ۸ پر فارسی میں ہے:

''حجاج ایرانی کہ از زیارت بیت اللہ الحرام برگشتند مقداری

از یں رسالہ را نزد ما آوردند و ملاحظہ نمودیم کہ چیزہائے در آن نوشتہ شدہ است کہ ہیچ مرد شیعی در ہیچ جا بان معتقد نیست از قبیل (العیاذ باللہ) قول تحریف قرآن کریم'' (ترجمہ نامہ حضرت آیۃ اللہ شریعت مداری بہ شخصیت ہائے اسلامی)

مطلب یہ ہے کہ

''حج کے موقع پر بعض غیر شیعہ افراد نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا ہے جس میں شیعوں کی طرف ایسی باتیں منسوب کر دی گئی ہیں جن کا کوئی شیعہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ جیسے قرآن مجید کا (معاذ اللہ) محرّف ہونا۔''

(۱۵) ادارہ تبلیغات اسلامیہ قم ہی سے ایک رسالہ شائع ہوا ہے ندای فکری برائے مسیحیان مسیحیت شمارہ ۱۳ اس میں ۹ پر لکھا ہے:

قرآن کریم در حال حاضر بہمان شکل کہ ہزار و چہار صد سال قبل بر پیغمبر محمدؐ نازل شدہ دست نخوردہ باقی ماندہ است --- و از نخستن روزہائے کہ قرآن از زبانِ پیامبر نقل شدہ است حتی یک کلمہ ہم تغیّر و تبدّل در آں رخ ندادہ و بہمان صورتیکہ وحی شدہ باقی ماندہ است۔

قرآن مجید اس وقت تک اسی شکل میں کہ جس طرح چودہ سو برس پہلے حضرت پیغمبر اسلام ﷺ پر اترا تھا بغیر کسی تصرف کے باقی رہا ہے اور شروع دن ہی سے جب قرآن حضرت پیغمبرؐ خدا کی زبانی پہنچا ہے ایک لفظ کا بھی تغیر و تبدیل اس میں نہیں ہوا ہے اور اسی صورت پر کہ جس طرح وحی ہوئی تھی، باقی رہا ہے۔

(۱۶) ''معارف الاسلام'' لاہور شمارہ دسمبر ۱۹۶۸ء میں صفحہ ۲۸ پر مولانا مرزا احمد علی امرتسری اعلی اللہ مقامہ نے مجلہ آستان رضوی مشہد مقدس'' سے اقتباسات درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مسلم اور محقق ہے کہ ''قرآن مقدس علوی ہمیں قرآن موجود است'' موجود

قرآن ہی حضرت علیؑ کا مقدس قرآن ہے ''قرآن کریم ہرگز دست خوش صدمت تحریف و زیادت نقصان نہ گردیدہ (خدائے قرآن این مہیمن جاوید آسمانی را بر طبق وعدۂ صدق خویش نگہبانی کردہ چنانچہ فرمودہ است اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰـفِظُوۡنَ ٥ (حجر آیت ۹)

و درایں کتاب حق کہ از مصدر حقیقت یزادانی فرود آمدہ ہرگز باطلے راہ نیافتہ ونخواہد یافتہ وَاِنَّهٗ لَـكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ ۙ لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ‌ ؕ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ ○ (حم سجدہ ۔۔۴۱، ۴۲)

یعنی: قرآن حکیم میں کوئی تحریف یا زیادتی یا کمی نہیں ہوئی اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے وعدہ کے مطابق اس کی حفاظت کی جیسا کہ اس نے فرمایا ہے کہ ہم ہی نے قرآن کو تارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس کتاب حق میں جو مصدر حقیقت سے اتری ہے کبھی بھی باطل کو راہ نہیں ملی اور نہ ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ کتاب عزیز ہے۔ اس کے پاس باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ حکمت والے قابل تعریف خدا کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے ''علمائے کبار شیعہ صریحاً عقیدہ خوردا مبنی بر صحت وسندیت وعدم زیادت ونقصان قرآن بیان کردہ اند'' یعنی شیعہ اثناءعشریہ اصولیہ کے اکابر علماء کا عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ قرآن وہی اور اسی صورت میں ہے جس میں حضرت سرور کائنات علیہ التحیات پر نازل ہوا تھا اس میں نہ تحریف ہوئی، نہ زیادتی ہوئی، نہ کمی ہوئی۔

(۱۷) خود میں نے تقریباً تینتالیس سال قبل اس موضوع پر ایک بسیط کتاب تحریر کی جس کا امامیہ مشن لکھنؤ سے جمادی الاول ۱۳۸۶ھ میں تیسرا ایڈیشن نکلا ہے اور اس کے علاوہ کئی ایڈیشن امامیہ مشن پاکستان کی طرف سے لاہور میں نکلے ہیں اس کے کچھ اقتباسات مذکور بالا تیسرے ایڈیشن کے صفحات کے حوالے سے ذیل میں درج ہیں۔

صفحہ ۶ ''اسلام کے لئے کچھ اصول اساسی ہیں کہ انہی کے اعتقاد کا مجموعہ اسلام کہا جاتا ہے اوران میں تمام فرقہ اسلامیہ باوجود اپنے آپس کے اختلافات کے برابر شریک ہیں''۔

بنیادی اصول الوہیت، رسالت، کتاب منزل، یعنی قرآن مجید اور روز قیامت یعنی معاد ہیں''۔

صفحہ ۷۔ ''لازم یہ ہے کہ تمام فرق اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب ربانی منزل من اللہ رسولؐ کا اعجاز ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان واعتقاد کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جز واعظم ہے'' اسی متفقہ ومتحدہ صورت پر باقی رہنے دیا جائے۔

صفحہ ۱۰۔ ''پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ حضرت کی نبوت دنیا کے آخری دور تک ہر وقت زندہ ہے کیوں کہ حضرتؐ کی نبوت و رسالت کی بنیاد صرف ان وقتی معجزات پر نہ تھی جو اس زمانہ میں موجود ہونے والے اشخاص ہی کے سر تسلیم کو خم کرا سکتے بلکہ حضرت کے دعوے کی بنیاد اس قرآن مجید پر ہے جو چودہ سو برس کے قریب گزرنے کے بعد بھی اس وقت زندہ ہے اور دنیا کو حق کی طرف دعوت دے رہا ہے۔

دنیا تہی دست ہے جب کہ اس کے پاس قرآن کے مثل کوئی کتاب نہیں لیکن مسلمان قرآن کی بدولت اس خزانہ عامرہ کے مالک ہیں جس کی نظیر صفحہ روزگار میں مل ہی نہیں سکتی۔''

صفحہ ۴۸۔ ''قرآن مجید کی اصلیت وحقیقت کے متعلق مسلمانوں کے اندر باوجود آپس کے ہزار ہا گونا گوں اختلافات کے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ وہ متفقہ حیثیت سے اس نقطہ پر مجتمع ہیں کہ قرآن مجید خداوند عالم کا نازل کردہ رسول عربی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر نازل شدہ ہے اور یہ کہ اس میں کسی انسان کی ساخت و پرداخت کو کوئی دخل نہیں ہے"۔

صفحہ ۲۰۴۔ (عنوان "تمام بحث کا آخری نتیجہ یا میرا عقیدہ")

موجودہ قرآن کلام الٰہی، وحیٔ آسمانی، رسولؐ کا اعجاز اور مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہے اس کے کسی جزء یا کل کے مفاد کی مخالفت، مخالفت خدا ہے اور اس کا اتباع ہر مسلمان کا رکن مذہب اور اہم ترین فریضہ ہے اس قرآن کے علاوہ کسی سورہ کسی آیت اور کسی حرف کو بھی جزء قرآن سمجھنا درست نہیں ہے اور نہ اس پر احکام قرآن مرتب ہو سکتے ہیں"۔

ساتواں تبصرہ

قراء سبعہ اور سبعۃ احرف

قرآن مجید جب سے یکجا ہو کر مکتوبی صورت سے عالم اسلامی میں منتشر ہوا اس کے حروف و الفاظ اور رسم الخط کی انتہائی حفاظت کی گئی اور اس کے الفاظ کی صورت و ہیئت میں کسی قسم کی تبدیلی روا نہ سمجھی گئی جس کی بناء پر اس کو وہ تواتر کا درجہ حاصل ہوا جو دنیا کی کسی کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

یہاں تک کہ بعض املا کی غلطیاں جو پہلے کاتب سے اتفاقاً ہو گئی تھیں جیسے **لا اذبحنه** کا درمیانی الف اور اسی طرح **لا اوضعوا** کا بیچ کا الف وہ اب تک قائم رکھیں گئیں اور قرآن کی کتاب میں اس الف کو ترک نہیں کیا جاتا۔

یہ معنوی حیثیت سے چاہے بلا ضرورت سمجھا جائے یا مضحکہ خیز بھی ہو، مگر انضباط و اعتبار کی حیثیت کو اس سے کافی تقویت پہونچتی ہے یورپ میں اس وقت بعض قلمی قدیم کتابوں کا بالکل فوٹو اتار کر شائع کر دیا جاتا ہے یا اگر اس کو نقل کراتے ہیں تو یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ جو لفظ جس طرح لکھا ہے اس کو اسی صورت سے نقل کیا جائے اس میں اگر کہیں کتابت اور املاء کی غلطی ہوتی ہے تو اس کو باقی رکھتے ہیں اور حاشیہ پر یا فٹ نوٹ میں لکھ دیتے ہیں کہ یہ لفظ صحیح معلوم نہیں ہوتا۔

بظاہر اس میں یہ غلطی ہے اور صحیح یوں ہے اس طرح حفاظت اور اہتمام پر روشنی پڑتی ہے جس سے کتاب کے اعتبار کو قوت حاصل ہو جاتی ہے لیکن جس طرح موجودہ زمانہ میں قاری ہوتے ہیں جن میں سے بعض قرآن مجید کے پڑھنے میں طریقہ تلفظ اور ادائے حروف کے سلسلہ میں ایسی فنکاریاں کرتے ہیں کہ لفظ کی آواز میں کچھ کا

کچھ انقلاب آجاتا ہے۔

اسی طرح صدر اسلام میں بھی قاریان قرآن بہت سے تھے اور ہر ایک کا طریقہ قرات ادائے حروف میں مختلف تھا۔ اس سے بہت سی قرأتیں پیدا ہوگئیں اور ہر ایک قاری کے جو شاگرد تھے وہ استاد کی پیروی میں اسی طریقہ خاص کے پابند ہوگئے۔

ان قاریوں کی قرأتیں نہ رسولؐ سے لی گئی تھیں اور نہ ائمہ معصومینؑ میں سے کسی سے اخذ کی گئی تھیں اس لئے انہیں دینی حیثیت سے سند کوئی حاصل نہ تھی پھر ان کی تعداد بھی کوئی محدود نہ تھی بلکہ یہ کثیر التعداد اشخاص ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے تھے جو اپنے اپنے ذوق طبعی کے لحاظ سے ادائے الفاظ میں جدّتیں کرتے تھے اور اسے مستقل قرأت کا درجہ دیتے تھے۔ لیکن بالکل اسی طرح جیسے فقہاء کی کثیر التعداد جماعت میں جب بادشاہ کی نظر توجہ اور عام خلقت کے میلان طبع نے چار آدمیوں کو خاص طور سے پسند کر لیا تو اہلسنت میں وہ چاروں بزرگ اس طرح مستند قرار پا گئے کہ ان کے بعد اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔

اسی طرح ان تمام قاریان قرآن میں سے سات آدمیوں کو منتخب کر کے انہیں ''قراءِ سبعہ'' کے نام سے تمام امت کا مرکز قرار دے دیا گیا کہ انہی سات آدمیوں میں سے کسی ایک شخص کی قرأت کے مطابق پڑھنا جائز ہے۔

ان ساتوں قرأتوں پر اتفاق کر لینے کے بعد دینی ماخذوں میں ان کے لئے سند تلاش کی گئی تو ایک حدیث دستیاب ہوگئی کہ ''نزل لقران'' ''علی سبعة احرف'' قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے''۔ بس اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ ساتوں قرأتیں وہ ہیں جو منشائے الٰہی کے مطابق ہیں۔

حالانکہ خود یہ حدیث اپنے لفظ و معنی کے اعتبار سے اس درجہ مضطرب و مبہم ہے کہ حافظ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ اس میں چالیس قول ہیں۔

اس سب کے برخلاف ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی یہ حدیث قرآنی عظمت کے بالکل مطابق ہے کہ:

ان القران واحد نزل من عند واحد

قرآن کی بس ایک شکل ہے اور وہ ایک ذات بے ہمتا کے پاس سے اترا ہے۔

اور ایک حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ سات حرف جو ہیں وہ تفسیری پہلوؤں سے متعلق ہیں۔

عن زرارة عن ابی جعفر علیہ السلام قال تفسیر القراٰن علیٰ سبعة احرف منه ما کان و منه ما لم یکن بعد ذالك تعرفه الائمّة.

زرارہ کی روایت ہے، امام محمد باقر علیہ السلام سے آپؑ نے فرمایا کہ قرآن کی تفسیر کی سات نوعتیں ہیں ان میں کچھ ماضی سے متعلق ہیں جس کا وقوع ہو چکا اور کچھ مستقبل سے متعلق ہیں جس کا وقوع ابھی نہیں ہوا اس سب کا ائمہ معصومینؑ جانتے ہیں۔ (بصائر الدّرجات۔ مطبوعہ ایران۔ ص ۵۲)

''سبعة احرف کی یہی تشریح قرآنی عظمت وجلالت سے تناسب رکھتی ہے''۔

آٹھواں تبصرہ

فہم قرآن کے سلسلہ میں مختلف نظریات اور صحیح نقطہ نظر

قرآن فہمی اور تفسیر کلام پاک کے بارے میں مختلف جماعتوں کے نقطہ نظر میں بڑا فرق ہے۔ ایک جماعت عقل انسانی کو اس کے معانی سمجھنے سے بالکل ہی قاصر سمجھتی ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن سمجھنے والے خاص افراد تھے جو اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں لہٰذا ہم صرف ان حضرات کے اقوال پر عمل پیرا ہو سکتے ہیں براہ راست قرآن سے ہم کسی حکم شرعی یا مسئلہ اعتقادی کو نہیں سمجھ سکتے یہ ہمارے یہاں کی اخباری جماعت ہے جس نے ادلہ احکام سے کتاب الٰہی کو بالکل خارج کر دیا ہے اور اپنے عمل کا دارومدار صرف اخبار و احادیث پر رکھا ہے۔

دوسری طرف وہ جماعت ہے جو قرآن مجید کے ہدایات کو اپنے لئے کافی قرار دے کر سنت کو بالکل نظرانداز کرتا ہے۔ یہ فرقہ مسلمان میں ''اہل قرآن'' کے نام سے موجود ہے جو اپنے تمام افعال وعبادات اور دیگر احکام شرعیہ کی بنیاد قرآن مجید پر رکھنے کا دعویدار ہے یہ دونوں ہی مسلک افراط وتفریط کے کرشمے ہیں۔

قرآن کے لئے پہلے ہی پارے کے آغاز میں یہ اعلان موجود ہے کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ یہ رہنما ہے پرہیز گاروں کے لئے دوسری جگہ کہا گیا ہے ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کا دائرہ بجائے خود تمام انسانوں کے لئے صدائے عام کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک اس صدا پر آتے وہی ہیں جو متقین ہیں یعنی اندیشہ انجام اور فکر نجات رکھتے ہیں کہیں اس کو ضیاء (روشنی) کہیں ذکر (یادآوری کا سامان) کہیں تبصرہ (آنکھیں کھولنے والا) کہیں شفاء لما فی الصدور

(سینوں کے اندرونی امراض کا شک وشبہہ اور کفر ونفاق وغیرہ کا علاج) کہیں فرقان (حق و باطل میں جدائی ڈالنے والا) اور کہیں بیان (حقیقتوں کا واضح کرنے والا) وغیرہ وغیرہ کہا گیا ہے جس سے مجموعی طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یقیناً وہ عام خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کے لئے اتارا گیا ہے اور دنیا کو اس کے مندرجہ مضامین پر غور کرنے، اس سے نتیجہ نکالنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت ہے وہ صرف بطور اوراد وادعیہ کے زبانوں سے تلاوت کر لینے اور بطور تعویذ ونقش کے گلے میں ڈال لینے اور بطور ایک محترم اور مقدس چیز کے سر آنکھوں پر رکھ لینے اور بوسہ دینے کیلئے نازل نہیں ہوا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس کا مطالب وحقائق سے فائدہ اٹھایا جائے، اس میں غور وخوض کیا جائے، نیز اس سے اپنی عملی زندگی کے لئے سبق حاصل کئے جائیں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن مجید ایک خاموش رہنما ہے وہ تعلیم کی عملی تشریح نہیں کر سکتا اور پھر اس میں اکثر مضامین بطور اجمال بیان ہوئے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے ساتھ ناطق رہنما کی ضرورت ہے جو اس کے تعلیمات کو اپنے عمل سے دنیا کے ذہن نشین کرے، اس کے مجملات کی تفصیل سمجھائے اور اس کے مبہمات کی توضیح وتفصیل کرے۔

یہ معلّم اپنے زمانہ میں پیغمبر خدا ﷺ تھے اور اس لئے خود قرآن مجید نے حضرت کی پیروی کی دعوت دی۔ (قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ)۔ اور لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور اسی سے کتاب کے ساتھ سنت کا ماخذ احکام ہونا ظاہر ہے۔

پھر رسولؐ نے اپنے بعد کے لئے اپنے خاص اہلبیت کو جو تعلیمات قرآنی کا مکمل نمونہ تھے قرآن کا ساتھی بتایا اور قیامت کے لئے ان دونوں کے ساتھ کا اعلان فرمایا۔

یہ حضرت کی مابین فریقین متفق علیہ حدیث ہے جس کا مشہور ومعروف متن یہ ہے

إِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِيْ اَهْلَبَيْتِيْ مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِيْ وَاَنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ.

میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑ تا ہوں اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیتؑ ہیں جب تک تم ان دونوں سے تمسک رکھو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہو ں گے یہاں تک کہ یہ دونوں وارد ہوں میرے پاس حوض کوثر پر قیامت کے روز۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسولؐ کے بعد قرآن کے ساتھ رہنمائی میں اہلبیتؑ کا مقام ہے۔ اس لئے قرآن مجید کی تعلیم پر صحیح عمل کے لئے جس طرح احادیث رسولؐ کو سامنے رکھنا ضروری ہے، اسی طرح آپؐ کے ان جانشینوں کے ارشادات کو جن کا حضرتؐ نے عترت اور اہل بیتؑ کی لفظوں کے ساتھ تعارف کرایا ہے۔

اس کے بالمقابل یہ نعرہ کہ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ ''ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے''۔ پہلے تو ہنگامی طور پر بلند ہوا۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری دور حیات میں جب حضرتؐ کی علالت پوری شدت پر تھی اور آپؐ نے قلم و دوات اور کاغذ طلب فرمایا کہ اپنے بعد کے لئے جو ذریعہ ہدایت ہے اس کی تحریری دستاویز چھوڑ جائیں تو کسی سیاسی پیش بندی کے طور پر یہ جملہ کہہ کے حضرتؐ کو آپ کے منصوبے کی تکمیل سے باز رکھا گیا مگر اس کے بعد بطور مسلک اس پر کوئی عمل نہیں کیا گیا ورنہ حضرت فاطمہ زہراؑ کو میراث سے محروم کرنے کے لئے اپنی ہی روایت کردہ ایک حدیث کو سند قرار نہ دیا جاتا اور اسی طرح برابر پیش آمدہ مسائل شرعیہ میں رسولؐ کے ارشادات اور فیصلوں کی تلاش کی جاتی

تھی اور ان کو حجت مانا جاتا تھا بلکہ لاشعوری طور پر سہی برابر اس حَسْبُنَا کے تصور کی رد ہوتی رہی۔ احادیث رسولؐ سے بھی اور اقوال علماء سے بھی چناں چہ عبیداللہ بن رافع کی روایت ہے کہ حضرت پیغمبرؐ خدا نے فرمایا:

لا الفين احدكم متكيا على اريكة يا تيه الا مر من امري بما امرت به او نهيت عنه فيقول لا ادري ما وجدناه في كتاب الله.

ایسا میں نہ دیکھوں کہ تم میں کوئی (اطمینان سے) گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہو اور میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی کے قبیل سے اس کے سامنے آئے اور وہ کہے میں اسے نہیں جانتا ہم نے اسے کتاب الٰہی میں تو پایا نہیں ہے۔

اسے محیی السنہ بغوی نے شرح السنۃ میں درج کیا ہے اور کہا ہے هذا حديث حسن یہ باعتبار سند حسن حدیث ہے۔ (دراسات اللّبیب۔ص ۵۵)

ایک جگہ یہ الفاظ ملتے ہیں کہ:-

لاعرفن رجلا اتاه الامر من امري ما امرت به اذ نهيت عنه فيقول ما هٰذا عندنا كتاب الله ليس هٰذا فيه.

مجھے خوب معلوم ہے ایسا شخص جس کے پاس میرا کوئی حکم اوامر یا نواہی میں سے پہنچے تو وہ کہے یہ کیا ہے؟ ہمارے پاس کتاب خدا موجود ہے اس میں تو یہ نہیں ہے۔

ایک روایت مقدام بن معدی کرب کندی کی ہے۔

اِنَّ رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال يو شك الرجل متكيا على اريكة يحدث بحديث من حديثي فيقول بيننا وبينكم

کتاب اللہ عزوجل فما وجدنا فیہ من حلال استحللناہ
وما وجدنا فیه من حرام حرمنا ہ آلا وان ما حرّم
رسول اللہ ﷺ مثل ما حرّمہ اللہ عزوجل.

جناب رسول خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ جلد ہی ایسا وقت آئے گا کہ ایک شخص گاؤ تکیہ سے لگا بیٹھا ہوگا اور اس کے سامنے میری حدیث پیش ہوگی وہ کہے گا کہ ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کن کتاب الٰہی ہے تو جو اس میں ہمیں حلال نظر آئے گا اسے ہم حلال سمجھیں گے اور جو اس میں حرام ملے گا اسے حرام سمجھیں گے خبردار آگاہ رہو کہ جسے رسولؐ خدا نے حرام کیا وہ ویسا ہی ہے جیسے اللہ نے حرام کیا ہو

ان دونوں حدیثوں کو عبدالکریم بن محمد سمعانی نے 'ادب الاملاء والاستملاء'' مطبوعہ مطبع بریل لیدن ۱۹۵۲ء صفحہ ۳ و ۴ میں درج کیا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر حَسْبُنَا کِتَابَ اللہ کی کوئی رد ہوسکتی ہے جو خود حضرت پیغمبر خدا ﷺ نے فرمائی ہے اور اس کے بعد برابر صحابہ اور تابعین اور علمائے اسلام بلاتفریق فرقہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس تصور کی رد کرتے رہے۔

چنانچہ اسی ''ادب الاملاء والاستمال ء'' صفحہ ۴ میں مشہور صحابی رسولؐ جناب عمران بن حصینؓ کا قول درج ہے کہ احادیث کے ذکر پر ایک شخص نے کہہ دیا کہ ارے حدیث کا ذکر چھوڑو ہم سے کتاب الٰہی کی بات کرو تو اس پر انہوں نے فرمایا:

انك احمق اتجد فی کتاب الله الصلوٰ ة مفسرة اتجد فی
کتاب الله الصّوم مفسراً آفی القراٰن حکم ذٰلك والسنة
نفسر ذالك.

تم بے وقوف ہو کیا کتاب الٰہی میں تمہیں نماز کی تفصیل ملتی ہے کتاب الٰہی میں روزہ کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ یہ سب احکام قرآن بیان کیئے ہیں اور تفصیلات سنت سے معلوم ہوتے ہیں۔

بلاتفریق فرقہ فقہ اسلامی یعنی علم شریعت کی تدوین اسی اصول پر ہوئی جو حَسْبُنَا کی باجماع امت عملی رد تھی اسے وضاحت کے ساتھ ملا محمد عبدالصمد پشاوری نے اپنی کتاب طلب الادب میں جو قاضی شوکانی کی کتاب ادب الطلب کی تلخیص ہے اور جسے ہندوستان کے مشہور عالم نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے اپنے اہتمام سے بھوپال میں چھپوایا ہے تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں (صفحہ ۳۹)

إذا لم یتقن علم السنة ولم یعرف صحیحه من سقیم
ولم یعول علیٰ اهل هٰذا الفن فی اصدارہ وایرادہ کانت
مصنّفا ته مبنیّة علیٰ غیر اساس لان علم الفقه هو ما
خوذ سنّة الا ما صرح بحکمة القرآن الکریم وهو قلیل.

جب کوئی شخص سنت کا علم کافی نہ رکھتا ہوگا اور احادیث میں درست و نادرست کا امتیاز نہ کرے گا اور اس فن کے ماہرین پر دلائل قائم کرنے اور نتیجہ نکالنے میں بھروسانہ کرے گا تو اس کے تصانیف بے بنیاد ہوں گے اس لئے کہ علم فقہ کا ماخذ عموماً سنت ہے سوا ان امور کے جن کے حکم کی صراحت قرآن مجید میں ہوگئی ہے اور وہ بہت کم ہیں

ہندوستان کے متاخرین اہل قلم بھی بلاتفریق فرقہ اس نعرہ حَسْبُنَا کی چاہئے لاشعوری طور پر ہو رد کرتے رہے ہیں جن میں سے یہاں صرف مولانا ابوالکلام کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

''انسانی سعادت کے لئے تعلیم محض بالکل بیکار ہے جب تک کہ اس تعلیم کے زندہ نمونے بھی انسانوں کے ساتھ نہ ہوں جو اثر طبیعت منفعلہ انسانیہ پر ایک انسانی نمونۂ عمل کا پڑتا ہے وہ محض تعلیم کی سماعت سے نہیں پیدا کیا جا سکتا اخلاق کی کتابیں اپنے موثر تعلیمات سے انسانوں کو رلا سکتی ہیں مگر ان کے دلوں کو نہیں پھیر سکتیں۔

عدالت کا قانون مجرم کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال سکتا ہے لیکن اس کے جرم سے باز نہیں رکھ سکتا حکماء کے حکیمانہ نصائح نیکوں کی بڑی بڑی تعریفیں اور بروں کی بڑی بڑی برائیاں بتلا سکتے ہیں لیکن کسی برے انسان کو نیک نہیں بنا سکتے''۔ ''بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سز کے بعد''

لیکن برخلاف اس کے اگر ایک پاک انسان اپنی زندگی کے اندر نیکی کا عملی نمونہ رکھتا ہو اور اس کے اعمال حیات راستبازی کے لئے اسوہ کا حکم رکھتے ہوں تو وہ صرف اپنا نمونہ دکھلا کر نہ صرف افراد اشخاص کو بلکہ اقوام واُمم کے اعمال کو یکسر پلٹ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت خلق اللہ کے لئے صرف کتابوں اور شریعتوں ہی کو نہیں بھیجا بلکہ اس کے ساتھ انبیاء کرام علیہم السلام کا (کہ ان کے حاصل تھے) عملی نمونہ بھی دکھلا دیا وہ جس دستور العمل کی طرف قوم کو بلاتے تھے اس کا عملی پیکر خود ان کی پاک ومطہر زندگی تھی۔

اگر شریعت بصورت قانون تختیوں اور کاغذوں پر منقوش تھی تو بصورت وجود حیَ وقائم ان کی زندگی کے اندر بھی پڑھی جا سکتی تھی اگر اس کی آیات بینات حروف واصوات کی شکل میں دنیا کو دعوت دیتی تھیں تو انبیاء کرام کی زندگی عمل وفعل کے اندر سے اس کی تصویر دکھلاتی تھی۔ اگر قانون کہتا تھا کہ انسان کو ایسا کرنا چاہئے تو حیات نبوت ثابت کر کے دکھلا دیتی تھی کہ اس طرح کیا گیا اور اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

''داستان کربلا مطبوعہ حیدرآباد دکن صفحہ ۲۴۲ یاد حسین علیہ السلام از مولانا ابو

لکلام آزاد۔''

یہی ضرورت تھی جس کے لئے بعد رسولؐ بھی ایسی ہستیوں کی ضرورت تھی جو قرآن کی تعلیم کا مکمل نمونہ اور اپنے قول وعمل سے اس کے شارح ومفسر ہوں۔ اسی ضرورت کی تکمیل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث ثقلین سے فرمائی۔

قرآن مشکل ہے یا آسان

حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کا نعرہ جو ہم سے دور لگا تھا اور اس کی صدائے بازگشت بیگانوں کے حلقوں اہل قرآن پرویز اور طلوع اسلام کی شکلوں میں بلند ہوئی جس پر سیر حاصل تبصرہ ہو چکا، نجانے کس طرح ہمارے آس پاس اس کا ایک دھماکہ ہو گیا۔ بعض خود رو قسم کے دعویداران تحقیق کے قلم سے ان الفاظ میں کہ ''قرآن آسان ہے''۔ بایں معنی کہ ہر شخص ترجمہ پڑھ کے قرآن سے مطلب نکال لے، یہ اس کی ہدایت کے لے کافی ہے کوئی ضرورت نہیں کہ وہ تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور اہل علم کی تشریح کا پابند ہوں۔ اس کے دلائل حسب ذیل دیئے گئے ہیں:

پہلی دلیل: قرن اول کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں مگر اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اس کے معنی اور مطلب صحیح طور پر نہیں سمجھتے ہیں اور اس کی ذمہ داری علمائے مذہب پر ہے جنہوں نے عام لوگوں کو اپنے پھندے میں پھانسے رکھنے کے لئے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں لکھنا شروع کیں، عجیب وغریب مسئلے گھڑتے ان مسئلوں کو قرآنی آیات سے مطابق کرنے کی کوشش میں قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کہ کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن کے معنی اور مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس طرح سے اس گروہ نے مسلمانوں کو قرآن مجید سے دور رکھا، حالانکہ اگر اس کے معنی عوام نہیں سمجھ سکتے تھے تو لوگ اسلام کیسے لائے تھے۔ یاد رہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔ ہر فرقہ اپنے اصولوں کی بیچ میں یا بادشاہت کی لاگ میں قرآن کے آیات کو اپنے مفید مطلب معنی پہنانے لگا اور کچھ دن بعد وہ اس کا ایمان ہو گیا۔

دوسری دلیل: کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور آسان زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے اگر نہ سمجھ سکے تو لکھنے والا قصوروار ہے نہ کہ پڑھنے والا لہٰذا کسی کتاب کا مشکل زبان میں ہونا اس کا عیب ہے نہ کہ خوبی قرآن بلیغ ہے اور بلیغ وہی کلام ہے جس سے کہنے والے کا مقصد سننے والے کے ذہن میں صحیح طور سے پہنچے۔

تیسری دلیل: ہم خود قرآن سے پوچھیں کہ وہ اس معاملہ میں کیا کہتا ہے؟

قرآن میں ہے کہ ہم قرآن کو ایسی کھلی اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں جس کو تم سمجھ سکو، اگر اس کو ایسی زبان میں نازل کیا جاتا جس کو تم نہ سمجھ سکتے تو کوئی ایمان نہ لاتا۔ عربی کے معنی خود صاف اور کھلی ہوئی زبان کے ہیں۔

۱۔ الٓرٰ قف کِتٰبٌ اُحۡکِمَتۡ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ خَبِیۡرٍ ۙ﴿۱﴾ (ھود۔۱)

وَلَقَدۡ جِئۡنٰہُمۡ بِکِتٰبٍ فَصَّلۡنٰہُ عَلٰی عِلۡمٍ ہُدًی وَّرَحۡمَۃً لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۵۲﴾ (اعراف۔۵۲)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نے کتاب بھیجی ہے وہ حکیم بھی ہے واقف کار بھی اس نے ہر طرح سمجھ بوجھ کر کتاب کو تفصیل وار بیان کر دیا ہے۔

۱۔ حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۚ﴿۲﴾ کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۚ فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ﴿۴﴾ (حٰم السجدہ۔ ۱تا۴)

۲۔ وَلَوۡ جَعَلۡنٰہُ قُرۡاٰنًا اَعۡجَمِیًّا لَّقَالُوۡا لَوۡلَا فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ ؕ ءَ اَعۡجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ ؕ (حٰم السجدہ۔ ۴۴)

ان آیتوں سے دو باتیں بالکل صاف ہوگئیں۔

(۱) قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری زبان عربی تھی، کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں ہے جس کو عرب نہ سمجھ سکتے تھے اور

(۲) ایمان نہ لانے کی یہ وجہ نہیں تھی کہ لوگ سمجھتے نہ تھے بلکہ منہ پھیر کر چل دیتے تھے اور سنتے ہی نہ تھے یعنی صحیح طور سے متوجہ نہیں ہوتے تھے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ''ہم نے تو قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے تو ہے کوئی جو نصیحت حاصل کرے۔'' اس ایک آیت کو سورۂ القمر کے اندر چار مرتبہ دہرایا گیا ہے کیا اس سے زیادہ زوردار الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن آسان ہے۔

چوتھی دلیل: ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں؟

قرآن کے لفظی معنی لیکچر کے ہیں قرآن میں ۱۱۴ سورے ہیں ہر سورہ بجائے خود ایک لیکچر ہے۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ ان لیکچروں کے درمیان میں لوگوں نے سوالات کر دیئے ہیں۔ ان کا جواب دے کر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا گیا ہے۔ موضوع قرآن حسب ذیل ہیں:

(۱) خدا کی عبادت کرو (توحید)

(۲) ایک ایسے دن پر ایمان لاؤ جس دن اپنے کئے دھرے کا جواب دینا ہوگا (یعنی قیامت)

(۳) ایک آدمی کو دوسرے آدمی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کے وقت کیسا برتاؤ کرنا چاہئے اور لڑائی کیسی لڑنی چاہئے (یعنی معاشرتی و جنگی احکامات وغیرہ)

(۴) ذیل کے اعتراضات اور ان کے جوابات ان میں کے دو اعتراض حضرت محمدؐ پر ہیں اور دو قرآن پر

(الف) رسولؐ خدا پر دو اعتراض:

(۱) چوں کہ حضرت محمدؐ ایسے انسان ہیں جیسے انسان ہوا کرتے ہیں لہٰذا حضرت محمدؐ رسول نہیں ہو سکتے۔

(۲) چوں کہ محمدؐ معجزہ نہیں دکھاتے ہیں لہٰذا رسول نہیں ہو سکتے۔

(ب) قرآن پر دو اعتراض:

(۱) قرآن نازل وازل کچھ نہیں ہوا، حضرت محمدؐ کی من گھڑت ہے۔

(۲) پہلے خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں موجود ہیں لہٰذا اب ایک اور کتاب نازل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

(۵) پرانے رسولوں کے قصے:۔

ان لیکچروں کا مضمون بہت چھوٹا سا ہے ان مضمونوں کو ہر لیکچر میں دہرایا گیا ہے۔

کہیں لوگوں نے سوالات بھی کئے ہیں خاص معاملات بھی آپڑے ہیں سوالات کے جوابات اور معاملوں کے متعلق حکم بھی دے دیئے گئے ہیں۔ اوپر بیان کیے ہوئے موضوع قرآن کو مدنظر رکھ کر قرآن کو پڑھیے اور پھر دیکھئے کہ قرآن سمجھ میں آتا ہے یا نہیں قرآن میں ایک ہی بات کو بار بار دہرایا گیا ہے اس سے مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے تو بات لوگوں کے دماغوں میں سمائے۔ اگر ایک لفظوں میں بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے لفظوں میں بیان کیا گیا، اگر ایک طریقہ سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو اسے دوسرے طریقہ سے بیان کیا گیا اگر اصول سمجھ میں نہ آیا تو مثال دی گئی ان اصولوں کو قصوں کی شکل میں بیان کیا گیا۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن جاہل سے جاہل اور عالم سے عالم دونوں کیلئے ہے۔

دوسرا اصول قرآن کو بلکہ ہر کتاب کو سمجھنے کا اس کے معنوں پر غور کرنا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذَالِکَ لَذِکۡرٰی لِمَنۡ کَانَ لَہٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ وَھُوَ شَہِیۡدٌ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُھَا.

(قٓ۔۳۷)

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُھَا ﴿۲۴﴾

(محمدؐ۔۲۴)

تیسری بات: مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔

چوتھی بات: اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں۔

پانچویں بات: آیتوں کے شان نزول کے جھگڑے بھی عام طور سے بیکار ہیں کیوں کہ ہر فرقہ نے شان نزول اپنے مطلب کے موافق گڑھ رکھی ہے آیت میں اصول بیان کیئے جاتے ہیں وہ اصول جب کبھی ایسا واقعہ ہوگا اس پر چسپاں ہوں گے۔ یہ بات بھی کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی کہ بے جوڑ آیتیں نازل ہوا کرتی تھیں۔ عام طور سے سورے نازل ہوتے تھے۔ یہ تھیں وہ اصولی باتیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ قرآن بالکل آسان چیز ہے اور اس کے لئے تفسیر کی ضرورت نہیں ہے مگر کیا یہ نتیجہ درست ہے؟ اس کے لئے ایک ایک کر کے مذکورہ پہلوؤں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

قرنِ اوّل کے مسلمانوں کا عمل بالقرآن

کیا یہ سچ ہے کہ قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقی حاصل کی؟

شخصیتوں سے مرعوب ہوئے بغیر دل کی لگتی کہیے قرآن کو سامنے رکھ کر بتایئے کہ قرآن میں کیا کہیں اس کا حکم ہے کہ تلوار لے کر آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرو، امن عالم کو غارت کرو اور لوگوں کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور کرو۔ اگر یہ سب عمل بالقرآن ہو تو غیر مسلمین کا یہ اعتراض بالکل درست ہوگا کہ اسلام خونریزی کا حامی ہے اور وہ تلوار کے زور سے اپنی اشاعت کراتا ہے کیا اپنے کسی دعوے کی حمایت کے لئے اسلام کے دامن کو داغ دار بنا دینا گوارا کیا جاسکتا ہے؟

کیا قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کا رواج تعلیم قرآن کے مطابق تھا؟

کیا سرمایہ داری اور سرمایہ پرستی کا رواج جس کے خلاف جناب ابوذر غفاریؓ احتجاج کرنے اٹھے تھے عمل بالقرآن کا نتیجہ تھا؟

کیا دمشق اور بغداد کی جہانداریاں صاف ستھرے اور سادے اسلام اور تعلیم قرآن کے موافق تھیں؟ کیا عیش وعشرت کی گرم بازاریاں اور توبہ شکن حلقوں میں ''مقدس'' درباروں کی آتش آشامیاں قرآن کی رو سے بالکل مناسب تھیں کیا جمل اور صفیں کی میدان داریاں، خود مسلمانوں کے گلوں پر مسلمانوں کی شمشیر آزمائیاں اور آپس کی فتنہ سامانیاں تعلیم قرآن پر عمل کا مظاہرہ تھیں؟

حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ الفاظ میں اتنی طاقت ہرگز نہیں کہ وہ انسانی حافظہ سے واقعات کی یاد فراموش کرسکیں۔ کیا کربلا کا تاریخی واقعہ کسی عبارت آرائی کے زور سے مٹ سکتا ہے؟ اور کیا جنگ حرہ اور مدینہ مکہ کی شرمناک داستانیں فنا ہو جائیں گی؟

ممکن ہے کہ ''خیر القرون'' کو سراہنے والے مسلمان آج ناواقف غیر مسلموں کے سامنے پرانے زمانہ کے مسلمانوں کو قرآن کا جامہ پہنادیں اور ان کی ناواقفیت سے فائدہ اٹھالیں مگر تاریخ کی دوربین سے اس زمانہ کے حالات کا مطالعہ کرنے والے ''گھر

کے بھیدی'' مسلمان بھی کیا اس فریب خیال کا شکار بن سکیں گے؟

بڑے نیک طینت، بڑے پاک باطن

ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

گنتی کے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی بدولت خواہ اس زمانہ کو ''خیر القرون'' کہہ لیجئے اور خواہ جو مقدس نام چاہئے بنا لیجئے جہاں تک عام حالات کا تعلق ہے، اتنی تاریکی نظر آرہی ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں کا ''دور جہالت'' اس کے سامنے مات ہے صرف اس لئے کہ عام طور پر نہ مسلمانوں نے قرآن میں تدبر کیا نہ قرآن کے معانی کی تشریح میں حقیقی رہنماؤں کا دامن تھا مانہ ان عملی مثالوں پر نظر ڈالی جنہوں نے اپنی سیرت کو قرآنی تعلیمات کی تصویر بنا رکھا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کو اپنی ناقص سمجھ ذاتی خیالات اور نفسانی خواہشوں کا جولان گاہ بنا لیا۔ اسی کا نتیجہ تھی مسلمانوں کی وہ ابتری پراگندگی اور پریشانی جس کا خمیازہ آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔

اب آج بھی مسلمانوں کو اس پردہ میں کہ قرآن مشکل نہیں آسان ہے۔ اسی کی تلقین کی جائے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی مگر یاد رکھیے کہ اس سے مسلمانوں کی حالت میں کوئی ترقی یا اصلاح نہیں ہوسکتی۔ بے شک اپنی من مانی باتوں کو از روئے قرآن جاہلوں کے ذہن نشین کرنے میں آسانی ہوگی۔ وہ ناواقف بارہے کا سید جو عربی کے سر پیر سے واقف نہیں یہ سن کر خوش ہوجاتا ہے کہ قرآن میں میرے وطن کا نام بڑی مہربانی سے ''برادر'' اس کی لفظ کے ساتھ موجود ہے۔ یَوْمَىِٕذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا''۔ اس بچارے کو کیا خبر کہ یہ ''اَخ'' برادر کے معنی میں نہیں اور وہ بَارَهَا شہر کا نام نہیں ہے بلکہ ''اخبار'' ایک لفظ ہے جو خبر کی جمع ہے اور وہ ''ھا'' کی طرف مضاف ہے جو مونث کی ضمیر ہے۔ مگر یہ باتیں اس کے سامنے کہی جائیں تو وہ سمجھے گا عالموں کی الٹی سیدھی تاویل ہے اور لہک لہک کر بار بار علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر

تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک جمع اور مضاف اور مونث کی ضمیر کی بحثیں اتنی دشوار ہیں کہ ''پاژند'' معلوم ہوتی ہیں اسے تو آسانی اسی میں معلوم ہوگی کہ وہ کہے ''اخ بارھا'' یعنی بارہا جو سادات کی بستی ہے اسے اللہ سبحانہ نے اپنے بھائی کے خطاب سے نوازا ہے۔

یا قرآن میں انگریزی زبان کی لفظ تلاش کرنے والا خوش ہوجائے یہ آیت سن کر:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

وہ اسے یوں سمجھتا ہے کہ ولم یکن لہ کفواً احمد سمجھتا ہے کہ ون انگریزی کی لفظ ہے۔

اب اگر کسی بچارے عالم کی شامت آئی اور اس نے کہا یہ ون انگریزی کی لفظ نہیں ہے یہ تو کفو کی لفظ کی جزء ہے اور تنوین سے نون کا تلفظ پیدا ہوا ہے جو اعرابی حرکت ہے کوئی مستقل لفظ نہیں ہے تو وہ فوراً کہے گا۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر

تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کے نزدیک یہ عالمانہ تشریح تاویل اور پاژند ہے اور سیدھی سادی بات جو قرآن سے نکلتی ہے وہ وہی کہ ون بمعنی واحد انگریزی ہے اور اس کی تفسیر ہے لفظ ''احد'' اور اس طرح اس کے نزدیک ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن خود اپنا مفسر ہے اور پھر وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بے کار ہیں۔

بتایئے اس ''بوالہوسی'' کا کیا علاج کیا جائے اور اب شیوہ اہل نظر کی آبرو کہاں رہ سکتی ہے۔

یہ بھی دیکھ لیجئے کہ قرآن کے عجیب وغریب معنی اور تفسیریں جو لکھی گئیں عجیب و غریب مسئلے جو گڑھے گئے ،قرآنی آیتوں کو وہ معنی پہنائے گئے جو کسی صورت سے پیدا نہیں ہو سکتے تھے یہ سب اسی دور کی پیداوار ہیں جسے ''قرن اول'' کہا جاتا ہے اور جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن پر عمل کر کے انتہائی ترقیاں حاصل کیں ۔ بعد کے مسلمان تو سب زلہ خوار ہیں انہی اگلے زمانہ کے مفسروں کے اور انہی کی تفسیروں میں سے کسی ایک کو لے کر اس پر اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کرتے ہیں مگر وہ مفسرین جن کی تفسیروں نے عجیب وغریب معانی کی بنیاد رکھی اور عجیب وغریب مسائل کی داغ بیل ڈالی وہ وہی صدر اسلام کے مفسرین ہیں جیسے مجاہد ضحاک سدی ،کلبی ، مقاتل وغیرہ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے اقوال سے کتب تفاسیر بھرے پڑے ہیں ۔

پھر یقین جانیے کہ عجیب وغریب معانی کی ایجاد اور تاویلوں کی تراش وخراش سب اسی اصول کے ماتحت تھی کہ قرآن آسان ہے اور ہر شخص اپنی سمجھ سے اس کے معنی بتا سکتا ہے یہی وہ خیال تھا جو جمہور اسلام میں عام طور پر پھیلایا گیا اور اس کے ماتحت قرآن کے آیات بازیچہ اطفال بنا لئے گئے ۔اس کے برخلاف اہلبیتؑ رسولؐ کا یہ اعلان تھا کہ قرآن کے معنی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔اس کے لئے بڑے معلومات کی ضرورت ہے ان کا اعلان یہ تھا کہ قرآن فہمی آسان نہیں بہت مشکل ہے اور اس کے لئے خاص رہنمایان دین کے ساتھ جن کو رسولؐ کی تشریحات براہ راست پہنچی ہیں تمسک کی ضرورت ہے۔

جمہور اسلام نے ائمہ اہلبیتؑ کی اس تعلیم کو نہ پہلے کبھی مانا اور نہ بعد میں ۔ اب تسلیم کرتے ہیں ۔ پھر اس ترقی وتنزیل کو جو جمہور مسلمین کے ساتھ متعلق ہے اس عقیدہ سے کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ مسلمانوں نے کسی وقت انتہائی ترقی کی اور اب مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل ہو گئے یہ ممکن ہے بجائے خود حقیقت ہو مگر اس کا قرآن فہمی کے کسی نظریے سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے ۔

اس کا سبب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مسلمان شروع شروع اس سادہ اور مساویانہ نظام زندگی پر بر بنائے عادت چلتے رہے جس کو پیغمبر اسلام نے رائج کیا تھا اور فطرت کے اس پیغام کو لے کر آگے بڑھے جو دلوں پر قبضہ کرنے کی طاقت رکھتا تھا،اس لئے وہ فتوحات حاصل ہوئے جنہیں آج ان کی بہت بڑی ترقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن یہی ترقی تنزلی کا پیش خیمہ بن گئی اس لئے کہ ان میں ملوکیت کا دور دورہ ہو گیا اور سلطنت وکامرانی نے عیش وعشرت کا عمل دخل کر دیا۔ کچھ دن تک دلوں پر بیٹھی ہوئی دھاک نے قوموں کا سر اٹھنے نہ دیا لیکن جب ان کی عملی کمزوریاں طشت از بام ہوئیں اور ان کے راز ہائے درون خلوت ،افسانہ ہر انجمن بن گئے تو سرگرم عمل قوموں کی جرات بڑھی ۔ان کی آپس کی رقابتوں اور داخلی کمزوریوں نے دشمن کی امداد کی اور آخر وہ ہوا جس کی بناء پر آج کہا جا رہا ہے کہ مسلمان سب سے زیادہ ذلیل ہیں ۔اگر ان کی ترقی قرآن کے سچے اصول کو سمجھ کر انہی حدود وقواعد کے اندر ہوتی جو قرآن کے تعلیم کردہ ہیں تو وہ کبھی تنزیل سے تبدیل نہ ہوتی ۔

وہ جماعت جو اقلیت میں تھی جس کے سرگروہ اہلبیتؑ معصومین تھے ،انہوں نے قرآن کے بارے میں مطلق العنانی اور غیر مشروط آزادروی کی اجازت نہیں دی بلکہ اس کے لئے حدود وقواعد مقرر کیئے اور ان کے تحت میں تدبر فی القرآن سے کام لیا ان کے مختصر گروہ نے ہزاروں مادی شکنجوں کے اندر گرفتار رہ کر بڑے روحانی فتوحات کئے اور دنیا میں کوئی جماعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس نے اتنے مشکلات اور مصائب کے باوجود اس طرح اپنی ہستی کو برقرار رکھا ہو اور اپنے دائرہ میں توسیع جاری رکھی ہو، یہاں تک کہ اس وقت دنیا کے ہر گوشہ میں کچھ نہ کچھ افراد اس اصول مسلک اور طریقہ کے پابند موجود ہیں ۔

اسے چاہئے کوئی ترقی سمجھے یا تنزیل، بہر حال وہ ایک محدود اور معتدل سطح پر ہمیشہ رہے ۔ نہ دوڑ کر زیادہ چلے اور نہ گرے مگر رہے یہ ہمیشہ اسی راستے پر کہ قرآن فہمی کوئی آسان بات نہیں ،مشکل ہے اور اس لئے انہوں نے تنہا قرآن کو اپنی رہنمائی کے

لئے کافی بھی نہیں سمجھا بلکہ اہلبیتؑ کے دامن سے تمسک ضروری خیال کیا۔اب اگر ان میں روحانی حیثیت سے کچھ تنزل نظر آرہا ہوتو اس کا سبب یہ سمجھنا چاہئے کہ ان میں بھی اب ایسے لوگ پیدا ہونے لگے ہیں جو ''ہمرنگ جماعت'' بن کر یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہے اور ہر شخص بذات خود اس سے نتیجہ نکال سکتا ہے اور اس کے لئے کسی غیر کی رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے دوستوں یہ خیال ہماری قومی زندگی کے لئے راس نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو سال بعد تک اسلام میں کوئی فرقہ نہ تھا۔

غالباً اس ادّعاء کے موقع پر پیش نظر ایران یا پنجاب اور حیدرآباد کے بابی، بہائی قادیانی، چکڑالوی اور مہدوی فرقے یا اپنے ہندوستان کے بریلوی اور دیو بندی فرقے ہیں جو انہی آخری دنوں کی پیداوار ہیں ورنہ جہاں تک اسلام کے ان فرقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے جن کے عقائد کتابوں میں مدون ہیں اور جن کے اختلافی مسائل پر بحث سے علم کلام کی تشکیل ہوئی ہے وہ تمام فرقے رسولؐ کی رحلت کے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہی پیدا ہوئے ہیں۔اس کے علاوہ اگر صدر اسلام کے واقعات پر نظر ڈالئے تو ان سے بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں بھی قرآن کی مختلف تاویلیں کی جاتی تھی اور اس کے معانی میں اکثر دشواری محسوس کی جاتی تھی پھر بتائے کہ کون سا وہ دور ہوسکتا ہے جب قرآن کے معانی ومطالب بالکل متفقہ حیثیت رکھتے تھے اور ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

بے شک قرآن کے مشکل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل ''چیستان'' ہے یعنی اس سے کوئی کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔یقیناً اہل زبان اس کے ظاہری معانی سے بہرہ اندوز ہوئے اور اسی کا اثر تھا کہ مشرکین دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور انہوں نے اس کے غیر معمولی اعجاز کا اندازہ کیا مگر غیر عربی داں طبقہ کے لئے یہ بات بھی مفقود ہے ان کے لئے قرآن کو آسان کہہ دینے کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

(۲) بلاغت کا مفہوم

کسی کتاب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ایسی صاف اور سادہ زبان میں ہو کہ پڑھنے والا لکھنے والے کے مطلب کو سمجھ سکے۔سوال یہ ہے کہ پڑھنے والا کون؟ ہر پڑھنے والا خواہ وہ زبان داں ہو یا غیر زبان داں سمجھ دار یا ناسمجھ؟ حاضر الذّہن ہو یا پریشان دماغ؟ اگر بلاغت کا معیار یہ ہے اور کسی کتاب کی خوبی یہی ہے تو عالم امکان میں کوئی کتاب بلکہ کسی متکلم کا ایک جملہ بھی اس معیار پر ٹھیک نہیں اترتا۔

جب تک دنیا میں زبانیں مختلف ہیں جب تک کہ دل و دماغ کی طاقتیں جداگانہ ہیں جب تک سننے والوں کی کیفیتوں میں اختلاف ہے اس وقت تک تو یہ ناممکن ہے کہ کسی کلام سے ہر پڑھنے والا پورا فائدہ اٹھا سکے اس لئے کم از کم آپ کو یہ قید تو لگانا ہی پڑے گی کہ جس زبان میں وہ کلام ہے اس زبان کے واقف کار اس کلام کو سمجھ سکیں اور اس قید کے لگانے کی وجہ سے ہی قرآن کی اس آسانی سے اردو داں طبقہ کی محرومی ظاہر ہے۔

خود ایک زبان میں مختلف مقامات کے محاوروں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک کلام سب کے لئے مساوی نہیں ہوسکتا۔مختلف شہروں کی زبان جدا، شہر اور دیہات کی زبان بالکل الگ الگ بلند اور سفید پوش طبقہ اور بازاری لوگوں کی زبان علیحدہ اور مردوں، عورتوں کی زبان مختلف ہوتی ہے اس لئے زبان کے اکثر فقرے ایسے ہوں گے جو کسی کے لحاظ سے آسان اور کسی کے لحاظ سے مشکل ہوں نتیجہ صاف ہے کہ سب کے لئے ان کی آسانی قائم نہیں رہ سکتی۔اب میں نہیں سمجھ سکتا کہ بلاغت کے مذکورہ معیار پر کون سا وہ کلام ہوگا جو بلیغ کہا جا سکے؟

کہا جا سکتا ہے کہ بلیغ کلام وہ ہے جو مخصوص مخاطبین کے لحاظ سے جن کو براہ راست متوجہ کر کے وہ کلام کیا جا رہا ہے دشوار گزار نہ ہو مگر اس صورت میں یہ تو نہیں کہا جا

سکتا کہ وہ ہر شخص کے لئے آسان ہی ہوگا اور کسی کو اس کے سمجھنے کے لئے شرح اور تفسیر کی ضرورت نہ ہوگی۔

پھر قرآن کی اگر وہ حیثیت ہے جیسا کہ معترض نے کہا ہے کہ وہ لیکچروں کا مجموعہ اور ان لیکچروں کے ضمن میں جو خاص سوالات ہوئے ہیں ان کا جواب بھی ہے تو بالکل ظاہر ہے کہ لیکچر کے ماحول، حاضر الوقت اشخاص کے معیار فہم اور سائلین کی ذہنیت کا لحاظ ضروری ہے یہی بلاغت کا حقیقی تقاضا ہے اس سے عمومی آسانی کا نتیجہ کہیں برآمد ہوسکتا ہے۔

اس پر بھی غور کر لیجئے کہ زبان میں زمانہ کے امتداد سے کتنے انقلابات ہوجاتے ہیں قرآن کی تنزیل کو ساڑھے تیرہ سو برس ہوئے ہیں غیر ممکن ہے کہ اس مدت میں تمام محاورات اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے خالص عرب اہل زبان بھی قرآن کے معانی کی صرف اپنی زبان دانی کے بھروسے پر نہیں سمجھ سکتے بلکہ انہیں بھی قدیم محاورات عرب کے تتبع قدیم ذخیرہ ادب پر عبور اور آیات و احادیث کے مختلف استعمالات میں غور وخوض کی ضرورت ہے اور اس لحاظ سے قرآن کے لئے بھی بالکل آسان نہیں ہے۔

اس کے علاوہ جہاں تک فصاحت اور سلاست کا تعلق ہے وہ الفاظ کے لغوی معنی اور کلام کے عرفی مفاہیم ہوسکتے ہیں لیکن جو کسی خاص شعبہ کے اصلاحات ہوتے ہیں وہ بہرحال اس شعبہ کے ماہرین کی تشریح پر موقوف ہوں گے۔ قرآن ایک خاص شریعت کا ترجمان بن کر آیا تھا، اس لئے اس میں اس قسم کے الفاظ اور معنی کی کمی نہیں ہے۔ صلوۃ، زکوۃ، حج، صیام، خمس، انفال، جہاد، وغیرہ سب اصطلاحی لفظ ہیں ان کی تشریح ہرگز صرف زبان دانی کی بناء پر نہیں ہوسکتی اس کے لئے ماہرین شریعت کی تفسیر کی ضرورت ہوگی۔
اس صورت میں کیوں کر کہا جا سکے گا کہ قرآن بالکل آسان ہے اور ہر شخص

اسے سمجھ سکتا ہے۔

پھر اب غور کیجئے کہ کلام کا مشکل ہونا جو بلاغت کے خلاف ہے اور جس کے لحاظ سے کلام آسان ہونا چاہئے وہ کیا ہے؟ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کلام میں عام اصول محاورہ کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ ہو جس کے وجہ سے محاورہ سے واقف اہل زبان اس کے معنی کو نہ سمجھ سکیں خواہ وہ الجھاؤ ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہو۔ اس کو اصطلاحاً تعقیدِ لفظی کہتے ہیں یا بعید از ذہن استعارات و کنایات کے استعمال سے ہو اس کو تعقید معنوی کہتے ہیں یا الفاظ ایسے صرف کئے گئے ہوں جن کے اس مفہوم کے لئے جو متکلم نے مراد لیا ہے عام طور پر فصحائے اہل زبان کچھ دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان الفاظ سے وہ واقف نہیں ہیں اس کو ''غرابت'' کہتے ہیں۔

لیکن اگر کلام بجائے خود اصول محاورہ کے مطابق ہے اور انہیں الفاظ پر مشتمل ہے جو اس کے دور ورود میں فصحاء کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے مگر اب ہمارے لئے مشکل ہے اس وجہ سے کہ ہم اس زبان سے اس دور کی زبان کے خصوصیات سے ناواقف ہوگئے ہیں تو اس طرح مشکل ہونا ہرگز کلام کا عیب نہ ہوگا بلکہ ہمارا نقص ہوگا کہ ہم اس کے سمجھنے کے لائق نہیں ہیں۔

اس کے بعد یہ دیکھئے کہ ایک ہوتے ہیں کلام کے لفظی معنی یہ تو ایک کلام ہے جو کہ سلیس زبان میں ہے ہر زبان داں جو ان محاورات سے واقف ہو سمجھ لے گا اور اگر نہ سمجھے تو خیر مان لیجئے کہ کلام کا نقص ہے لیکن ایک ہوتے ہیں وہ مطالب جو لفظی معانی کی تہوں میں پوشیدہ ہوتے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جتنا غور کیا جائے اتنے نتائج اور حقائق کلام سے زیادہ منکشف ہوتے جائیں۔ یہ وہ چیز ہے جو متکلم کی بلندی اور قابلیت کے لحاظ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہیں اور کلام کے اس حیثیت سے سمجھنے کے لحاظ سے انسانی جماعت کا مجمع اتنا ہی چھٹتا جاتا ہے جتنا بلند متکلم کا وہ کلام ہے۔

اب اگر یہ صحیح ہے کہ قرآن ایک غیر معمولی درجہ کا کلام ہے تو ضرور اس میں یہ بلندی موجود ہوگی اور یقیناً انسانی دماغ کی ایک بلند سطح ہی وہ ہوگی جو اس کے معانی و نکات کا اچھی طرح ادراک کر سکے۔

اگر اس میں یہ بات نہیں ہے اور وہ بالکل ہی سطحی باتوں پر مشتمل ہے جن کو ہر معمولی انسان پوری طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے آگے اس میں کچھ تو یہ آسانی ''یقینا'' اس کا نقص ہے۔

(۳) قرآن سے ثبوت

اب خود قرآن سے پوچھئے کہ وہ کیا کہتا ہے؟

اپنے کو آسان بتاتا ہے یا مشکل؟ اس کے لئے ذیل کے آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) متعدد آیات میں رسولؐ کے فرائض میں تلاوت آیات کے ساتھ تعلیم کتاب کو قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

(سورۃ بقرۃ۔۱۲۹)

يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ بقرہ۔۱۵۱)

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورۃ آل عمران۔۱۶۴ و۔سورۃ جمعۃ ۲)

اس سے ظاہر ہے کہ رسول ﷺ کا کام تھا آیات کتاب کو پڑھ کر سنانا (یہ کام الفاظ سے متعلق ہے) اور اس کتاب کی تعلیم دینا (یہ معانی سے متعلق ہے)

اگر قرآن آسان ہوتا اس طرح کہ ہر شخص اس سے خود ہی سب کچھ سمجھ لیتا تو تعلیم کی ضرورت نہ تھی۔

(۲) هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (آل عمران۔۷)

> ''اس نے آپؐ پر کتاب اتاری ہے جس میں کچھ تو کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو ''ام الکتاب'' ہیں اور کچھ ''متشابہہ'' ہیں۔ فتنہ پردازی اور تاویل سازی کے لئے، حالانکہ نہیں جانتا اس کی تاویل کو مگر خدا اور ''راسخین فی العلم'' کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے ہیں سب ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نہیں اس سے اثر لیتے مگر وہ لوگ جو سمجھ دار ہوں۔''

اب آپ دیکھیے کہ قرآن خود بتلا رہا ہے کہ اس میں دو قسم کی آیتیں ہیں کچھ آسان اور کچھ مشکل اور یہ کہ مشکل آیتوں کی اصلی تاویل کو سب نہیں جانتے بلکہ اس کے جاننے والے مخصوص ہیں میں نے ترجمہ میں ''ام الکتاب'' اور ''متشابہہ'' کی اصلی لفظوں کو اس لئے لکھ دیا کہ قرآن کو آسان کہنے والے خود ہی ان کے معنی سمجھ لیں تفسیر کی کیا ضرورت؟

اور دوسرے اشخاص کے لئے اس کے واسطے مستقل تبصرہ آئے گا جس میں اس کی مکمل تشریح کی جائے گی۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا

الۡاَلۡبَابِ.

یہ وہ کتاب ہے جو ہم نے آپ پر نازل کی ہے بابرکت تا کہ یہ لوگ اس
کے آیات میں غور کریں اور تا کہ صاحبان عقل اس سے اثر قبول کریں

جو شئے بالکل کھلی ہوئی اور آسان ہو اس کے لئے غور کی ضرورت نہیں ہوتی نیز
صاحبان عقل وفہم سے مخصوص کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل سطحی مطالب پر مشتمل
نہیں ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوۡنَ الۡقُرۡاٰنَ اَمۡ عَلٰی قُلُوۡبٍ اَقۡفَالُهَا.

تو وہ کیا قرآن میں غور نہیں کرتے؟ کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں

اس آیت میں لوگوں سے شکوہ کیا گیا ہے کہ اگر قرآن بالکل سطحی ہوتا تو غور و
خوض کی ضرورت نہ ہوتی

اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَذِكۡرٰی لِمَنۡ كَانَ لَهٗ قَلۡبٌ اَوۡ اَلۡقَی السَّمۡعَ
وَهُوَ شَهِيۡدٌ.

اس میں یاد دہانی ہے اس کے لئے جو دل و دماغ رکھتا ہو یا کان لگائے اس
حالت میں کہ حاضر الذہن ہو

جو چیز بالکل سطحی اور آسان ہوتی ہے اس کے لئے ان شروط کی ضرورت نہیں
ہے ہر شخص خود ہی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

اب جو آیتیں بتلائیں۔ کہ قرآن آسان ہے ان کے معنی وہی سمجھنا چاہئیں جو
ہم نے ''بلاغت'' کی بحث میں اس سے پہلے لکھے ہیں یعنی اس کلام میں عام اصول محاورہ
کے خلاف کوئی ایسا الجھاؤ نہیں ہے جس کی وجہ سے اصول محاورہ سے واقف اہل زبان اس
کا مطلب نہ سمجھ سکیں اور یہ کہ اس کی زبان آسان ہے نہ یہ کہ اس کے مطالب سطحی ہیں جن

کو ہر شخص بغیر کسی غور و تامل یا تعلیم کے سمجھ سکتا ہے۔

اب ان آیات پر نگاہ بھی ڈال لیجئے۔

کچھ وہ آیتیں ہیں جن میں قرآن کے (مفصل) ہونے کا ذکر کیا گیا ہے مگر اس
کی تفصیل میں خود قید موجود ہے **(لقوم یعلمون)**

ملاحظہ ہو آیت ۱ تا ۳ حم السجدہ

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ تَنۡزِيۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۚ﴿۲﴾ كِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰيٰتُهٗ
قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۳﴾

دوسری آیت وَنُفَصِّلُ الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ﴿۱۱﴾ (سورہ توبہ۔۱۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا مفصل ہونا ہر شخص اور ہر جماعت کے لحاظ
سے نہیں ہے پھر ان آیات سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن ہر شخص کے لئے
آسان ہے اور اہل علم کی تشریح و تفسیر کی ضرورت نہیں ہے۔

کچھ وہ آیات ہیں جن میں قرآن کی زبان کو ''مبین'' کی لفظ سے یاد کیا ہے
مگر ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے، وہ خود قرآن کو آسان کہنے والے کی زبان سے سن لیجئے:

قرآن عربی زبان میں اس قوم کے لئے جو عربی جانتی تھی یعنی جس کی مادری
زبان عربی تھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے اور ایسی زبان میں قرآن نہیں جس کو عرب نہ سمجھ
سکتے تھے۔

اب بتایئے کہ اس آسانی سے غیر عربی داں طبقہ کو بلکہ ان کو جن کی مادری زبان
عربی نہیں ہے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے وہ بہرحال زبان کی تشریح و تفصیل کے محتاج ہوں
گے اور تفسیر کی ضرورت باقی رہے گی۔

یاد رکھنا چاہئے کہ جو ایک زبان میں زیادہ آسان ہوگا، وہی دوسری زبان میں

زیادہ مشکل ثابت ہوگا۔

بات یہ ہے کہ زبان کی آسانی روزمرہ کے محاورات کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے اور محاورے ہی وہ ہوتے ہیں جن کا ترجمہ بعض اوقات مشکل اور بسا اوقات غیر ممکن ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر اپنی زبان میں مشکل عبارت ہوتو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں استعارے کنائے صرف ہوئے ہیں یا دقیق مطالب ہیں اور یہ دونوں چیزیں وہ ہیں جو دوسری زبان میں منتقل ہوسکتی ہیں۔

پھر اگر قرآن کو عربی زبان والوں کے لئے آسان کہا بھی گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکل سکتا ہے کہ وہ سب کے لئے آسان ہے اور مطلب تو یہی تھا کہ ہمارے اردو دان طبقہ کو آسانی پیدا ہوا اور انہیں علماء سے دریافت کرنے اور تفسیر وتشریح کی جستجو کی ضرورت نہ ہو مگر یہ مطلب قرآن کی آیتوں سے کسی طرح نہیں نکلتا۔

(۴) قرآن کا مطالعہ

ہم خود قرآن کو پڑھیں اور دیکھیں کہ سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ مجھے نہیں معلوم قرآن کو پڑھ کر دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ اصل الفاظ قرآن کو دیکھ کر؟ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سمجھنا عربی دانی پر موقوف ہے اور غیر عربی دان ہرگز نہیں سمجھیں گے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ترجمہ کو پڑھ کر؟ بظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کے ثبوت میں بہت سا وقت قرآن کی آیتوں کے ترجمے پیش کرنے پر صرف کیا گیا ہے۔ مگر یاد رکھیئے کہ یہ ترجمے سب عربی دان لوگوں کے کئے ہوئے ہیں اگر یہ سمجھ میں آجاتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوگا کہ یہ ترجمے آسان ہیں لیکن یہ نہیں ثابت ہوگا کہ قرآن بالکل آسان ہے۔

آسان ہونے کے ثبوت میں اپنی سمجھ کا مظاہرہ اس طرح کرنا کہ قرآن کے معنی لیکچر کے ہیں (حالانکہ یہی غلط ہے قرآن کے لفظی معنی ''لیکچر'' کے نہیں بلکہ ''ریڈنگ''

کے ہیں) اور ان لیکچروں کا موضوع یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو' قیامت پر ایمان لاؤ وغیرہ یہ سب باتیں بالکل آسان ہیں لہٰذا قرآن آسان ہے۔ میرے خیال میں اگر آسان ہونے کا یہی معیار ہے کہ اس طرح کا ایک خلاصہ آدمی سمجھ لے تو دنیا کی کوئی کتاب مشکل نہیں ہے۔

بڑی سے بڑی فلسفہ کی دقیق کتاب آسان ثابت کی جاسکتی ہے یہ کہہ کر کہ اس کا موضوع یہ ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کن باتوں کے کیا اسباب ہیں اور منطق کی کتاب اس کا موضوع یہ ہے کہ کن طریقوں سے نامعلوم باتیں معلوم کی جائیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر کوئی کتاب جو مشکل ہوتی ہے وہ ان جزئیات اور خصوصی مطالب کے لحاظ سے جو اس عام موضوع کے تحت میں بیان کے گئے ہیں۔۔ اس لئے قرآن کو بھی اس مجمل خلاصہ کے اعتبار سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ اس کے تفصیلی مضامین کے لحاظ سے تب آسان اور مشکل ہونے کا فیصلہ ہوسکتا ہے۔

قرآن کی آسانی کے ثبوت میں بہت سی آیتوں کے تراجم پیش کیئے گئے ہیں مگر یاد رکھیے کہ تراجم سب تفسیر کے ماتحت ہیں یعنی جس قسم کی تفسیر کو مترجم نے قبول کیا ہے اس کے مطابق آیت کا ترجمہ کیا ہے ان تراجم سے مدد لینا حقیقتاً تفاسیر کا پابند بننا ہے پھر تفسیر سے بے نیازی کا دعویٰ کیوں کر قابل قبول ہوسکتا ہے۔

ترجمے صرف تحت اللفظی معنی پر مشتمل نہیں ہوا کرتے ورنہ بعض اوقات شاید ان سے کچھ بھی مطلب سمجھ میں نہ آئے بلکہ بریکٹ میں توضیحی الفاظ محذوفات کی خانہ پری کے لئے ضمیمے درج کیے جاتے ہیں ان کا اقرار خود سابقہ دلائل کے ذیل میں موجود ہے کہ: ''مترجم قرآن میں بریکٹ ( ) کے اندر جو لکھا جاتا ہے وہ ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے بڑھاتا ہے قرآن میں ایسے کوئی لفظ نہیں ہوتے۔''

اس طرح کے ترجموں کو حقیقتاً ایک مختصر تفسیر سمجھنا چاہئے پھر ان ترجموں کی مدد

سے اگر قرآن آسان ہو گیا تو اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکلے گا کہ وہ بغیر تفسیر کی مدد کے خود آسان ہے۔

بے شک اگر قرآن کے معنی قرآن ہی سے سمجھ میں آجائیں تو تفاسیر وغیرہ سب بیکار ہیں مگر یہ اس وقت ہے جب کوئی شخص تنہا الفاظ قرآن سے معنی سمجھ لے لیکن اگر اس نے مترجمین کی تفسیروں سے مدد لے کر معنی سمجھے تو تفاسیر بیکار کہاں ثابت ہوئے؟

شان نزول کو بیکار سمجھنا یہ کہہ کر کہ ''عام طور سے جو اصول بیان کے جاتے ہیں وہ اصول شان نزول کے پابند نہیں ہوتے بالکل غلط ہے اکثر آیتیں بنیادی حیثیت سے شان نزول ہی سے مخصوص ہیں مثلاً قرآن میں کہا گیا اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ۔۔۔الخ (المائدہ۔ ۳)

''آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کیا''۔ اب جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ آیت کس دن اتری؟ ''آج سے کیا مطلب سمجھا جائے؟

یا یہ آیت کہ: اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوا الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمۡ رٰکِعُوۡنَ﴿۵۵﴾ (المائدہ۔۵۵)

اگر خصوصیت واقعہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ عام اصول کہاں ہے کہ جو حالت رکوع میں زکوۃ دے۔ اس کے واسطے ولایت ضرور ثابت ہو یا یہ آیت کہ۔

عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ کُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ فَتَابَ عَلَیۡکُمۡ وَعَفَا عَنۡکُمۡ۔ (بقرہ۔۱۸۷) آخر کس اصول کی حامل ہے؟

یہ کہنا کہ ''عام طور پر سورے نازل ہوتے تھے، متفرق آیتیں نہیں اترتی تھیں، حقیقت کے بالکل خلاف ہے چھوٹے سورے تو خیر اکثر ایک ساتھ اترے ہونگے مگر جو بڑے سورے ہیں ان میں خود آیت کا مضمون صاف بتلاتا ہے کہ وہ مختلف موقعوں پر اتری ہوئی ہیں اگر سورے ایک ساتھ نازل شدہ ہوتے تو آیتوں میں ناسخ اور منسوخ آیت

ایک ہی سورہ میں موجود نہ ملتی خصوصاً اس طرح کہ ناسخ پہلے اور منسوخ بعد کو نیز مکی اور مدنی آیتیں مخلوط نہ ہوتیں حالانکہ موجودہ ترتیب قرآن میں یہ سب کچھ باتیں ہیں۔

اس کا ذکر ہمارے رسالہ ''تحریف قرآن کی حقیقت'' میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

اب مذکورہ بالا بیانات کی روشنی میں ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مشکل ہے یا آسان۔

نواں تبصـــرہ

تفسیر واصول تفسیر

تفسیر بالرائے کے معنی تنزیل وتاویل میں فرق

مُحکم ومتشابہہ میں امتیاز اور تفسیر قرآن کے شرائط

گزشتہ تبصرہ میں فہم قرآن کے بارے میں جوافراط وتفریط کی کارفرمائیاں ہیں ،ان کا تذکرہ ہو چکا جن سے ایک طرف ہمارے یہاں اخباری حضرات پیدا ہوئے اور دوسری طرف اہلسنت میں ''اہل قرآن'' یا پرویزی جماعت کا وجود ہوا۔

یہ تو منظم جماعتیں ہیں جنہوں نے ایک طرف مستقل فرقوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے علاوہ غیر ذمہ دارانہ طور پر انفرادی خود رائیوں کے کرشمے ہیں جن میں ایک طرف موجودہ زمانہ کا (بخیال خود) ''روشن خیال'' گروہ ہے جو اپنی آزادروی کے لئے قرآن مجید کے اجمال سے فائدہ اٹھانے کے لئے یہ نعرہ بلند کرتا ہے کہ قرآن سے ثبوت ہونا چاہئے اور جب قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے تو ہم سے اس کی پابندی کا مطالبہ کس لئے؟

کچھ خودرَو قسم کے محققین ہیں جو قرآن فہمی کے مبادی کو طے کیئے بغیر فہم قرآن کے مدعی ہوکر اپنے طبع زاد خیالات کو قرآن کے سر منڈھتے ہیں۔

بعض واعظین نکتہ آفرینی کے ذوق میں یا مجمع سے داد حاصل کرنے کے لئے یا نادانی کے باوجود ہمہ دانی کے مظاہرہ میں آیات قرآن کے لئے ایسے طبعزاد معانی کا

اختراع کرتے ہیں جو الفاظ کتاب الٰہی سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ مذکورۂ بالا بے راہ رویوں کے دیکھنے کے بعد جب ہم ہادیانِ دین کے ارشادات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کا مضمون ہمیں بظاہر مختلف نظر آتا ہے۔

ایک طرف تو قرآن مجید سے استفادہ کی دعوت دی گئی ہے احکام شرعیہ میں بطور استدلال آیات قرآن کو اس پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آیات اس حکم کے سمجھنے کے لئے کافی ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کا سمجھنا عام اہل علم وفضل کے لئے ناممکن شے نہیں ہے۔

دوسری طرف یہ ارشاد ہوا ہے کہ **اِنَّمَا یعرف القرٰان مَنۡ خوطب بہٖ**۔ قرآن کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اسکے حقیقی مخاطب ہیں''۔ اس کے ساتھ تفسیر بالرّائے کو گناہ عظیم بتلاتے ہوئے ارشاد کیا:

مَنۡ فَسَّرَ الۡقُرۡاٰنَ بِرَاۡیِہٖ فَلۡیَتَبَوَّاۡ مَقۡعَدَہٗ مِنَ النَّارِ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی وہ اپنا ٹھکانا آتش جہنم میں بنالے۔

یہ بھی ارشاد کیا کہ:

مَنۡ فَسَّرَ الۡقُرۡاٰنَ بِرَاۡیِہٖ فَاِنۡ اَصَابَ فَقَدۡ اَخۡطَاَ.

جس نے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی اس نے اگر ٹھیک بھی کہا تو بھی غلطی کی۔

مطلب یہ ہے کہ جو معنی اس نے اپنی رائے سے بتائے ہیں، چاہے اتفاق سے وہ صحیح بھی ہوں لیکن یہ کام بہرحال غلط ہے جو اس نے کیا۔ اس طرح قرآن مجید میں عقل آرائیوں کا سد باب کردیا۔ ضرورت ہے کہ ایک طرف مذکورہ سابق حد افراط یا تفریط تک نکل جانے والے خیالات کی تعدیل کی جائے یعنی اس نقطہ اعتدال کا پتہ لگایا جائے

جہاں تک تفسیر قرآن کے سلسلہ میں جانا درست ہے اور جس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں اور دوسری طرف ان احادیث واخبار میں مطابقت پیدا کر کے ان کو ایک نقطہ پر جمع کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ ان کا مجموعی طور پر مفاد کیا ہے؟

اس کے لئے حسب ذیل تمہید پر غور سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے الفاظ سے استفادہ معانی جو الفاظ ومعانی کے مخصوص ارتباط کا نتیجہ ہے غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعدد مرتبے اور مختلف درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ لفظ جو کسی معنی کے لئے وضع ہوئی ہے جب گوش گزار ہو تو فوراً ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہو جائے اور وہ معنی دماغ میں گردش کرنے لگیں اس کے لئے یہ ضرورت یہ نہیں یہ کہ متکلم نے وہی معنی مراد بھی لئے ہوں، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس لفظ کا اظہار کرنے والا کوئی بافہم وشعور متکلم ہو، بلکہ دروازہ کے کھولنے بند کرنے میں اس کے چوکھٹ باز و اور چولوں سے اگر آواز نکلتی ہو اور کسی خاص لفظ کی تشکیل کر رہی ہو جو کسی معنی کی حامل ہے تو ذہن میں وہ معنی آئیں گے ضرور، حالانکہ معلوم ہے کہ وہ کسی متکلم کے زبان وذہن کی لفظ نہیں کہ اس سے یہ معنی مراد بھی ہوں۔ یہ دلالت، دلالت تصور یہ ہے کہ اس لئے کہ لفظ کے سننے کے بعد صرف معنی کا خطور ذہن میں ہوتا ہے اس پر کوئی حکم ایجابی یا سلبی نہیں لگایا جاتا لہٰذا تصور ہی تصور ہے تصدیق کا پتہ نہیں ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ لفظ کے استعمال کے ساتھ معنی ذہن میں آئیں اور اس طرح کہ متکلم نے یہی معنی مراد بھی لئے ہیں اور استعمال لفظ کا اسی معنی میں کیا ہے۔ اس کو کہا جائے گا دلالت تصدیقیہ اس لئے کہ یہاں تصور ہی تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ حکم بھی ہے کہ متکلم نے یہی معنی مراد لئے ہیں۔

یہ دلالت اسی وقت پیدا ہوگی جب متکلم فہم وشعور رکھتا ہوا اور اس نے ارادہ کے ساتھ کلام کیا ہو لہٰذا دروازہ سے سنائی دینے والی آواز میں یہ دلالت پائی نہیں جا سکتی

اس طرح اگر متکلم باشعور ہستی ہو مگر بوقت تکلم معلوم ہے کہ قصد وارادہ موجود نہیں ہے جیسے: سرسامی کا ہذیان اور مست بے ہوش کی بکواس، اس صورت میں بھی دلالت تصدیقیہ کا وجود نہ ہوگا۔

دلالت تصور یہ تو لفظ کے گوش زد ہوتے ہی فوراً پیدا ہوتی ہے اور بدلتی نہیں لیکن دلالت تصدیقیہ برقرار صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کلام ختم ہو جائے اور کوئی قرینہ اس کے خلاف نہ آئے اس لئے کہ اکثر خاتمہ کلام کے موقع تک ایسے قرائن آجاتے ہیں جو لفظ کو پہلے معنی سے ہٹا کر کسی دوسرے معنی کا جامع پہنا دیتے ہیں مثلاً متکلم کی زبان سے نکلا ''رَاَیْتُ اَسَداً'' جس کا ترجمہ ہے ''میں نے شیر دیکھا''۔ یہاں مخاطب کے کان میں لفظ ''اَسَداً'' پہونچتے ہی ''شیر'' کے معنی ضرور آجائیں گے اور شیر بھی وہی جو جنگل والا ہے یہ دلالت تصور یہ ہے کہ اور ابھی ذہن میں خیال بھی یہی ہوتا ہے کہ وہی مراد ہے لیکن مختتم طور پر یہ فیصلہ کہ یہی مراد ہے اس وقت ہوگا کہ جب اس کی بعد ''یرمی'' کا لفظ نہ آجائے یعنی وہ تیراندازی کرتا ہے۔ اگر یہ یا ایسی ہی کوئی لفظ آگیا تو دلالت تصدیقیہ منقلب ہو جائے گی اور یہ سمجھا جانے لگے گا کہ اس سے مراد مجازی معنی ہیں یعنی بہادر انسان۔

ان دونوں دلالتوں کے بعد تیسرا درجہ یہ ہے کہ کلام کے مقصود اصلی کا پتہ چلایا جائے کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ کے بجائے خود معنی کچھ ہیں اور وہ بحیثیت استعمال الفاظ مراد بھی ہیں لیکن اصلی مقصود وہ نہیں ہیں بلکہ اس معنی سے ذہن کا منتقل کرنا منظور ہے کسی اور چیز کی طرف جو درحقیقت بتلانا منظور ہے جیسے کنایہ کی صورت میں کہنے والا کہتا ہے میں اب تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا''۔

اس جملہ میں کوئی لفظ اپنے اصلی معنی کے علاوہ دوسرے معنی میں مستعمل نہیں ہے لیکن پھر بھی اصلی مقصود اس جملہ کے کہنے سے یہ نہیں ہوتا کہ ''میں قدم نہ رکھوں گا'' بلکہ

یہ کہ ’’میں آؤں گا نہیں‘‘ اس بناء پر اگر وہ خود اپنے پیروں پر اس کے گھر میں نہ جائے بلکہ کسی سواری پر داخل ہو تب بھی اس کا عمل اس کے قول کے خلاف قرار پائے گا۔

چوتھا درجہ یہ ہے کہ لفظ معنی اور مقصود کلام اس سب کے تمام ہونے کے بعد سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اس کلام سے اشارہ کس امر کی طرف ہے۔ مثلاً اتفاق سے مخاطب نے کبھی اس متکلم سے کہا تھا کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ آج یہ اسی طرح کہہ رہا ہے کہ میں تمہارے گھر میں قدم نہ رکھوں گا اور اس کا اشارہ اس کے کہنے سے اس طرف ہو کہ یہ بدلا ہے تمہاری اس دن کی بات کا جو تم نے کہی تھی یہ قسم پہلے تینوں درجوں سے بالکل مختلف ہے وہ درجے لفظ اور اس کے معنی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ چیز جسے ہم نے چوتھے درجہ پر قرار دیا ہے لفظ اور اس کے معنی سے بالکل خارج ہے۔

اس بناء پر کسی شخص کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ میں نقل بالمعنی کی صورت میں یہ حق حاصل ہے کہ انسان ان الفاظ کے تحت اللفظی معنی کو الفاظ کی الٹ پلٹ کے ساتھ جو معنی کی تبدیلی کا باعث نہ ہو یا مرادفات کے استعمال کے ساتھ بیان کرے۔ مثلا پاؤں اس کے گھر میں نہ رکھوں گا اسے بیان کردے کہ اس نے کہا میں اس کے یہاں قدم نہ رکھوں گا‘‘۔

کیوں کہ ان الفاظ کے معنی یہ ہیں اس لئے ان الفاظ کا بھی منسوب کرنا اُس کی طرف صحیح ہے اِسی طرح جو اصل مقصود ان الفاظ کا جو سمجھ میں آیا ہے اسے بھی منسوب کرسکتا ہے۔ مثلاً، کہے کہ اس نے کہا میں اُس کے یہاں اب کبھی نہیں جاؤں گا۔

مگر وہ خارجی چیز جو چوتھی قسم میں ذکر کی گئی ہے جو کلام سے بطور اشارہ نکالی جاتی ہے وہ ہرگز مقولہ، متکلم قرار نہیں پاسکتی اور نقل قول کے موقع پر اس کا ذکر صحیح نہیں ہے مثلا مذکورہ بالا مثال میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس نے کہا ’’یہ تمہاری اس دن کی بات کا جواب ہے کیوں کہ اس نے یہ بات کہی ہرگز نہیں تھی بلکہ اس کی بات سے جو اس نے کہی

تھی ہم نے اپنے ذہن سے یہ اشارہ پیدا کیا تھا لہٰذا اسے اس قائل کی طرف بطور مقولہ منسوب کرنا کسی صورت سے صحیح نہیں ہے۔

دوسرا فرق ایک اور ہے وہ یہ کہ الفاظ کے پہلی قسم کے معنی ہمیشہ ایک ہی ہوسکتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ ایک لفظ سے بوقت واحد ایک زیادہ معنی مقصود ہوں لیکن یہ معانی کہ جو بطور اشارہ نکل سکتے ہیں وہ ایک سے بہت زیادہ ہوسکتے ہیں بلکہ کلام اتنا ہی اعلیٰ پایہ کا ہوگا جتنے اس قسم کے معانی اس میں زیادہ پیدا ہوسکیں۔

پہلی قسم کے معانی الفاظ کی واضح لغوی سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر قرائن لفظیہ و معنویہ سے وابستہ ہیں جو بہرحال محدود و منضبط ہیں لیکن دوسری قسم کے معانی میں سننے والے کی ذہنیت اور اُفتادطبع کا بڑا دخل ہے کیوں کہ یہ معنی لفظ کے تحت میں نہیں ہوتے بلکہ لفظ کے معنی و مطلب کو سمجھ کر پھر سامع خود ایک رائے قائم کرتا ہے جس میں اکثر سامع کے حسن ظن یا بدگمانی وغیرہ کا اثر ہوتا ہے اور وہ متکلم کے ذہن میں بھی نہیں ہوتے جیسے محفل میں ایک شخص درزی پیشہ کسی کے ان الفاظ کو کہ ’’خدا کے فضل سے مجھے چوری کی عادت کبھی نہیں رہی ہے‘‘۔ سن کر یہ رائے قائم کرلے کہ اس میں مجھ پر تعریض منظور ہے کہ اس شخص کی چوری کی عادت ہے جیسا کہ کہاوت ہے ’’چور کی داڑھی میں تنکا۔‘‘

اسی طرح سابق و حال کے حالات کو پیش نظر رکھ کر کبھی یہ اشارہ پیدا کرلیا جاتا ہے حالانکہ متکلم کو بہ وقت کلام ان حالات کا لحاظ نہیں ہے۔

غرض یہ کہ اس قسم کے اشارے پیدا کرنے میں وسعت بہت بڑی ہے مگر اس میں قدم قدم پر غلطیاں واقع ہونے کا امکان ہے۔

ایک شخص کسی کو اپنا دشمن سمجھتا ہے لہٰذا اس کی ہر بات میں اپنے لئے کچھ نہ کچھ برا پہلو پیدا کرتا ہے حالانکہ بہت ممکن ہے کہ اس نے نیک نیتی کے ساتھ وہ کلام کیا ہو اور کسی برے پہلو کا قصد نہ رکھا ہو اور ایک شخص جو دوسرے کو اپنا دوست سمجھے ہوئے ہے وہ اس کی

ہر بات میں محبت ہی کا پہلو محسوس کرتا ہے چاہے اس بات کرنے والے کے ذہن میں نہ ہو ۔ یہ چار درجے ہیں جو کسی نہ کسی طرح مقصودِ کلام کی تعیین کے مرحلہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔

ایک پانچویں چیز ہے اور وہ تعیین مصداق کلام یعنی لفظ کے جو بھی معنی کسی نہ کسی صورت سے سمجھ میں آئے ہیں اب یہ دیکھا جائے کہ وہ معنی کس فرد میں پائے جاتے ہیں اور کون ان کا مصداق یا مصداق کی فردِ اکمل قرار پاتا ہے۔

اس کا شرح کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بالکل خارجی اور واقعاتی اور کبھی کبھی اعتقادی چیز ہوتی ہے۔

عام کلام میں جسے شرح کہتے ہیں اسی کو قرآن کی نسبت سے تفسیر کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تفسیر کا تعلق تو کسی نہ کسی درجہ میں معنی کلام الٰہی کے ساتھ ہوتا ہے اب کسی لفظ کے اس معنی کو برقرار رکھتے ہوئے اگر مشاہدہ، تجربہ یا عقل یا موجودہ تحقیقات کی رہنمائی سے کام لے کر اس کے کسی ایسے مصداق کا اظہار کیا جاتا ہے جسے سابق میں نہیں لکھا گیا تو یہ "تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہیں ہوسکتا۔

مثلاً

(۱) قرآن مجید میں ہے:

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ. اس کے معنی صاف ظاہر ہیں کہ خداوند عالم مالک ہے دو مشرقوں کا اور دو مغربوں کا مشرق سے مراد بھی جیسا کہ اس کے ظاہری معنی ہیں مشرق آفتاب اور مغرب سے مراد مغرب آفتاب۔

اب اگر کوئی شخص یہ کرے کہ اس کے معنی کو بدل دے اپنی عقل پر زور دے کر مثلاً یہ کہہ دے کے مشرقین سے مراد "مشرق آفتاب نبوت اور مشرق خورشید امامت ہے یہ

تو یقیناً معنی میں تصرف ہے اس لئے ہماری آئندہ بحث سے تعلق رکھتا ہے لیکن مشرق و مغرب کے ظاہری معنی کو برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کرنا کہ یہ دو مشرق اور مغرب کون سے ہیں؟ تفسیر نہیں ہے۔

سابق زمانہ کے مفسرین نے مشرقین و مغربین کا مصداق گرمی اور جاڑے کا مشرق و مغرب قرار دیا، اس لئے کہ ان کے ذرائع معلومات محدود تھے۔ ان کو اس زمانہ کے ایسے انکشافات حاصل نہ ہوئے تھے۔ اب اگر کوئی شخص موجودہ زمانہ کے حاصل شدہ معلومات کی بناء پر یہ کہے کہ مشرقین و مغربین کا حقیقی مصداق امریکہ کے انکشاف سے سامنے آیا ہے اور دو مشرق اور دو مغرب اس قطر زمین پر جدھر ہم ہیں اور اس قطر زمین پر جدھر امریکہ واقع ہے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور یہ آیت قرآن کی امریکہ کے وجود کا پتہ دے رہی تھی جسے اسی وقت کے لوگ نہ سمجھے تھے اور یہ اس کا ایک اعجازی پہلو ہے جواب سامنے آیا ہے تو یہ تفسیر بالرائے نہ ہوگا اس کے لئے ہم کو قول معصوم سے سند کی ضرورت نہیں ہے جب کہ خود قرآن مجید میں بغیر کسی تصرف معنوی کے دو مشرق اور دو مغرب کا ذکر موجود ہے اور اب تک ہم اپنی کوتاہی معلومات سے دو مشرقوں اور دو مغربوں کا اتنا نمایاں طور پر علم نہ رکھتے تھے جو اسے ہمیں حاصل ہے تو ہم کیوں نہ المشرقین اور المغربین کا مصداق انہیں سمجھیں یہ ہرگز گناہ نہیں ہے۔

(۲) رَبُّ المشارِقِ وَرَبُّ الْمَغَارِبِ.

یہاں دو ہی مشرقوں اور دو ہی مغربوں کا نہیں بلکہ اس سے زیادہ مشرقوں اور مغربوں کا پروردگار اُسے بتایا جارہا ہے اس کے سمجھنے میں سابق زمانہ کے مفسرین کو بڑی دشواری پیش آئی آفتاب تو ایک ہے پھر بہت سے مشرق اور بہت سے مغرب کہاں سے آئے اس لئے بیچاروں نے مشارق و مغارب سے مراد ہر دن کا مشرق اور مغرب قرار دیا

کہ آفتاب اپنی ذاتی شرکت کی بناء پر سال میں ہر دن ایک نئے مشرق سے نکلتا ہے اور ایک نئے مغرب میں ڈوبتا ہے اس بناء پر مشارق اور مغارب کہا گیا ہے۔

لیکن اب جب کہ تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ آفتاب ایک نہیں ہے جتنے ستارے ثابت کہے جاتے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مستقل نظام ہے اور اس نظام کے تحت میں ہر ایک کے سیارے ہیں۔

ان تمام آفتابوں کے لئے اپنے سیارات کے اعتبار سے طلوع ہے اور غروب اس لئے مشارق اور مغارب کا مصداق بلاتکلف ان آفتابوں کے مشرق اور مغرب ہیں۔

ایسا کہنا اگر صرف ذاتی عقل کے صرف کرنے سے بھی ہو تو بھی تفسیر بالرائے نہ ہوگا، چہ جائیکہ واقعہ یہ ہے کہ آفتابوں کا متعدد ہونا ائمہ معصومینؑ کے احادیث میں بھی وارد ہوا ہے تو احادیث سے بھی مشارق اور مغارب کے اس مفہوم کو سمجھا جا سکتا ہے۔

(۳) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عالم متعدد ہیں اور حضرت احدیت ان تمام عوالم کا پروردگار ہے۔

معنی آیت کے صاف ہیں ان میں کوئی گنجلک نہیں ہے مگر یہ بہت سے عالم کون ہیں؟

ذہن میں تصور تو یہی تھا کہ عالم بس ایک ہے جس میں ہم بسے ہوئے ہیں۔ تو اب یہ بہت عالم کیا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا بیچارے مفسرین نے سوچ سوچ کر یہ کہا کہ عوالم سے مراد انواع کائنات ہیں یعنی پتھر ایک عالم ہے درخت ایک عالم ہیں جانور ایک عالم ہیں اور آدمی ایک عالم ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں یہ سب تو اسی ایک عالم کے اجزاء ہیں بہت سے عالم کہاں ہیں لیکن کیا کیا جائے کہ اس کے آگے اس وقت نظر کی رسائی نہ تھی اب جبکہ یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا اس نظام شمسی میں محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے نظام

بھی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے سیارات ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری اس دنیا کی طرح ایسی کتنی پوری پوری دنیائیں موجود ہیں تو اب عالموں کے بہت تعداد میں ہونے کا مسئلہ ہو گیا۔

اب اگر ہم کہیں کہ قرآن نے پہلے ہی اس جہان کے آگے دوسرے جہانوں کے وجود کا پتہ دیا تھا تو اسے تفسیر بالرائے کے تحت میں لانا صحیح نہیں ہوگا۔ حالانکہ یہ بھی احادیث سے ثابت ہے کہ عالم ایک نہیں بلکہ بہت ہیں۔

اس طرح کی آیتیں قرآن مجید کی اور ہیں جن کے معنی کا انطباق تحقیقات جدیدہ پر بہت نمایاں ہے جنہیں بعض اہل قلم نے مستقل طور پر موضوع تصنیف بنایا ہے مگر یہاں مثال کے لئے اتنا ہی کافی معلوم ہوتا ہے اور اس قسم کے نمونے جتنے آئیں جہاں معنی و مطلب میں کوئی تبدیلی نہ کی جا رہی ہو بلکہ مصداق کو نمایاں کیا جا رہا ہو اس کے لئے کبھی حدیث و تفسیر کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے اپنی عقل اپنے مشاہدہ اور جدید معلومات سے ثابت کیا جا سکتا ہے اور وہ ہرگز ہرگز تفسیر بالرائے کے تحت میں مندرج نہ ہوگا۔

تفسیر معانی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی کے معنی ہیں:

''کَشْفُ الْمُبْهَمِ'' یعنی استفہام مستعمل ہے یعنی کسی امر کو واضح کرنے کی خواہش علامہ سید رضی جامع نہج البلاغہ اپنی کتاب حقائق التاویل صفحہ ۱۳ میں تحریر فرماتے ہیں۔

معنی التفسیر والتاویل انما یکون لما غمض وخفی ولم یعلم بظاهره وهذا صفة المتشابه واما المحکم الذی یعلم بظاهره فلا حاجة باحد الیٰ تعلیمه لانّ اهل

اللسان فیه سواسیة.

تفسیر و تاویل کا معنی کے لحاظ سے تعلق ایسی چیز کے ساتھ ہے جو گہری ہو باریک ہو اور سطحی نگاہ سے معلوم نہ ہو۔ یہ بات متشابہات میں ہوتی ہے لیکن محکم آیتیں جن کا مفہوم کھلا ہوا ہو ان میں کسی کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ تمام اہل زبان ان میں یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اب ہم نے معانی الفاظ اور ان کے سمجھنے کے سلسلہ میں سابقاً جو درجے لکھے تھے ان پر نظر ڈالئے تو ان میں پہلا ایک قہری حیثیت رکھتا ہے جو لفظ کے کسی معنی کے لئے وضع ہونے اور اس کا علم حاصل ہونے کا نتیجہ ہے یہ لفظ کے سنتے ہی معنی کا ذہن میں آنا طبعی لازمی ہے لہٰذا تفسیر بالرائے کا اس سے تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا درجہ یعنی الفاظ کو سن کر قرائن حالیہ و مقالیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ رائے قائم کرنا کہ اس لفظ کے یہ معنی ہیں یہ بھی ہر زبان دان کا فطری حق ہے جو سلب نہیں ہو سکتا بے شک یہ حق اس وقت سلب ہو جاتا ہے جب متکلم نے اس کی صراحت کر دی ہو کہ اس کا کلام عام محاورات پر مبنی نہیں ہے بلکہ تمام تر اس کے ذاتی اصطلاحات پر مبنی ہے یا کلام کچھ اس طرح کا ہو کہ اس سے روزمرہ کے محاورات کے ماتحت کوئی معنی نکلتے ہی نہ ہوں اس طرح تو دوسری کیا پہلی قسم کی دلالت بھی جو وضع الفاظ پر مبنی ہے حاصل نہ ہوگی۔

قرآن میں بس حروف مقطّعات کو چھوڑ کر جو اس آخری قسم میں داخل ہیں باقی پوری کتاب میں یہ بات نہیں ہے اسے کہہ دیا گیا ہے وہ عربی زبان میں ہے اور اس میں غور و تامل کا حق ہی نہیں دیا گیا ہے بلکہ دعوت دی گئی ہے أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا۔ (یہ لوگ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں)۔ اس کی سچائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (نساء۔ ۸۲)

اگر یہ غیر خدا کی جانب سے ہوتا تو انھیں اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

اگر قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے معنی ہی کسی کی سمجھ میں نہیں آتے تو اس میں غور و فکر کی دعوت کیوں دی جاتی ہے اور پھر اس میں اختلاف ہونے نہ ہونے کا اندازہ انہیں کیوں کر ہو سکتا تھا؟

اس میں صاف موجود ہے کہ إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا (ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا ہے) بلکہ ارشاد ہوا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (یہ صاف کھلی ہوئی عربی زبان میں ہے''۔)

غور کیا جائے تو عقلی دلیل بھی ان آیات کے مفاد میں مضمر نظر آتی ہے۔

قرآن مجید رسالت مآب ﷺ کا معجزہ ہے اور اعجاز کا دار و مدار اس پر ہے کہ جس چیز میں اس دور کے لوگوں کو ادعائے کمال ہو اس میں ان کی طاقتوں کو شکست دی جائے جس کی تشریح بحث اعجاز میں آ چکی ہے۔

ہمارے رسولؐ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا دور دورہ تھا لہٰذا آپ کو معجزہ اسی نوعیت کا عطا ہوا جو قرآن مجید ہے۔ اب اگر یہ کسی اور زبان میں ہو جو ان کی زبان سے الگ ہے تو اس کے سبب سے اس کا اعجازی پہلو ختم ہو جائے گا اور قوم پر حجت تمام نہ ہوگی اس لئے ایک زبان کے بڑے سے بڑے ماہرین کا دوسری زبان کی چیز کے جواب سے عاجز ہونا کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے جو دلیل حقانیت بن سکے۔

متعدد آیات میں اس امر کا اظہار کہ یہ قرآن عربی زبان میں غالباً اس اعجازی پہلو کے نمایاں کرنے کے لئے کہ دیکھو یہ کوئی نئی زبان ہے بلکہ یہ اسی زبان کے روزمرہ

میں ہے جس میں تم کو فصاحت و بلاغت کا انتہائی دعویٰ ہے اس کے باوجود تم اس کے جواب سے عاجز ہو تو سمجھو کہ یہ کسی بالا دست طاقت کا اتارا ہوا ہے۔

اب جب یہ بات یقینی طور پر ثابت ہوگئی کہ قرآن مجید کی کوئی الگ زبان نہیں ہے تو اس کے بعد ہر عربی زبان والے کو اس کے معانی و مطالب سمجھنے کا حق حاصل ہے جس میں محاورات عرب سے واقفیت کے سوا کوئی شرط نہیں ہے۔

بے شک یہ صورت حال دردانگیز ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر شخص جو عربی سے کوئی حس و مس نہ رکھتا ہو وہ بھی قرآن فہمی کا مدعی ہے۔

اس کو سوا دماغی ''بوالہوسی'' کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا جس کے بعد ''شیوہ اہل نظر'' کی آبرو کا جانا یقینی ہے۔

اس کے بعد تیسرا درجہ یعنی کلام کے مقصود اصلی کی تعیین بضمیمۂ قرائن ہیں اور اس لئے ہر لفظ کے معنی میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اس سے کسی بھی دوسرے معنی کو بطور مقصود اصلی قرار دے دیا جائے بلکہ وہ دوسرے معنی ایسے ہی ہو سکتے ہیں جو اس لفظ کے اصل معنی کے ساتھ اتنا قریبی تعلق رکھتے ہوں کہ ایک سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہو سکے اور اس لئے الفاظ کے محاورات و اصطلاحات سے واقفیت کی صورت میں جس طرح انسان ان کے تحت اللفظی معانی کے سمجھنے کا حق رکھتا ہے اسی طرح ان معانی کے مطلب اور مقصود اصلی کے استفادہ کا حق بھی ہے۔

اسی لئے کثیر التعداد احادیث میں مختلف مقامات پر ائمہ معصومین علیہم السلام نے احکام شرعیہ کے استفادہ کے لئے آیات قرآن کا حوالہ دیتے ہوئے رواۃ احادیث کو یہ حق دیا ہے کہ وہ قرآن مجید سے شرعی احکام کو حاصل کریں۔

بے شک یہ امر ملحوظ رہے کہ کنایات اور مجازات کی تعیین میں ان تمام اصول و شرائط کو مدنظر رکھنا ہوگا جو اہل زبان نے مقرر و معین کیے ہیں مثلاً یہ کہ اگر معنی حقیقی کا مراد لینا

ممکن ہے اور اس کے خلاف کوئی قرینہ نہیں ہے تو خواہ مخواہ معنی مجازی یا کنایہ پر اس کا محمول کرنا درست نہیں ہے اور صرف اپنی ذاتی رائے سے جو کسی عقلی یا نقلی دلیل پر مبنی نہیں ہے ایسا کرنا تفسیر بالرائے ہوگا۔ اس کے علاوہ جب معنی حقیقی کا مراد لینا ممکن نہ ہو تو پھر اسے کنایہ یا مجازی معنی کو مراد لینا درست ہوگا جو محاورہ اور استعمال عرفی کے مطابق ہوں ایک ایسے بعید معنی پیدا کرنا جو اس معیار کے تحت میں داخل نہ ہوتے ہوں اصول تکلم کے لحاظ سے صحیح نہیں ہے اور اس صورت میں یہ کہنا کہ مراد خداوندی یہ ہے تفسیر بالرائے ہوگا۔

تفسیر بالرائے کی چند مثالیں

(۱) قرآن مجید میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کا ذکر ہے

.............کبھی خالق کی زبانی:

(۱) تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۲) تُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

(۳) تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِإِذْنِيْ. (مائدہ۔۱۱۰)

☆ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور کبھی خود حضرت عیسیٰؑ کی زبانی

(۱) اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۴۸)

(۲) اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ ؀

(آل عمران۔۴۸)

مفہوم ان جملوں کا عربی لغت اور روز مرہ کے لحاظ سے بالکل صاف ہے جسے ہر عربی دان بلا تکلف الفاظ کے سنتے ہی سمجھ لیتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے ایک مجسمہ بصورت طائر بناتے تھے اور اس میں پھونکتے تھے وہ بحکم خدا سچ مچ کا پرندہ بن جاتا تھا۔

(۲) کور مادرزاد اور کوڑھی کو شفا بخشتے تھے۔

(۳) مردوں کو بحکم خدا زندہ کرتے تھے۔

ہر آدمی جو عربی سے اس حد تک واقف ہو کر ان الفاظ کے معنی سمجھ سکے وہ ان الفاظ کو سن کر فطری طور پر یہی معنی سمجھے گا پھر یہ کسی اصول عقلی کے خلاف بھی نہیں ہے بلکہ ان میں کی ہر بات خالق کی قدرت کے دائرہ میں ہے اور اس لئے اس کی جانب سے اس کے کسی خاص بندہ کے ہاتھ سے ان کاموں کا وقوع میں آنا ممکن ہے۔

مگر اب ایک طبقہ ہے جو طے کیے ہوئے ہے کہ ہم معجزہ کی قسم کی باتوں کو نہیں مانیں گے اس کے ایک خاص نمائندہ نیاز صاحب فتحپوری تھے۔انہوں نے الفاظ آیت کے عجیب عجیب معانی بتلائے ہیں۔

''مٹی سے'' کی لفظ سے مراد ہے انسان کہ جو مٹی سے بنایا گیا ہے۔

''پرندے کی صورت'' اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں صلاحیت پیدا کی جائے فضائے روحانیت میں اڑنے کی۔''پھونکنے'' سے مراد ہے۔ہدایت کی روح کا پہنچانا اور تکون طیرا باذن اللہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ معارف و ہدایت کو حاصل کر کے ہوائے معرفت میں پرواز کرنے لگتا ہے۔''اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتے کے معنی'' ان لوگوں کو ہدایت کرنا جو بالکل علوم و معارف سے بے بہرہ تھے اور۔''مُردوں کو زندہ کرنے کے معنی ہیں کافروں کو مومن بنانا اور گمراہوں کو ہدایت کرنا۔

مولانا مرزا احمد علی امرتسری نے اپنے رسالہ بابیت و مرزائیت کا تقابل صفحہ ۳۱ میں ان لوگون کے طبع زاد تاویلات میں بھی ان آیات کا یہی مفہوم لکھا ہے کہ ''ہیت طیر وغیرہ انسانی خاکی پیکر اور طیر روحانی پرواز پھونک سے مراد لی گئی ہے۔

(۲) قرآن مجید میں روز قیامت اور اس کے علامات حشر ونشر اور مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے کا بہت آیتوں میں تذکرہ ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی چیز قرآن میں اس کثرت کے ساتھ اور اتنی اہمیت دے کر بیان نہیں کی گئی ہے جس قدر روز

قیامت کا تذکرہ لیکن بہاء اللہ مازندرانی کی امت جو ''بہائی'' کے نام سے معروف ومشہور ہے، ان تمام آیتوں کے معانی دوسرے کہتی ہے۔ وہ ''قیامت'' سے مراد ظہور الٰہی یعنی خداوند عالم کے خاص نمائندہ کا ظہور جوان کے نزدیک بہاء اللہ تھے۔

''نفخ صور'' سے مراد ہدایت کرنے والے کی آواز مردوں کے قبروں سے اٹھائے جانے سے مراد بے علم وعرفان افراد کا روح علم سے زندہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس طرح دنیائے لفظ ومعنی میں انقلاب پیدا کردیتے ہیں۔

(۳) قرآن کی آیت ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ

''مہر لگادی خدا نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لئے سخت عذاب ہے''۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ کفار ومشرکین کی مذمت ہے لیکن صوفیا کے ایک طبقہ نے جنہیں ایران میں اہل عرفان کہا جاتا ہے اس کو اہل معرفت ارباب عشق صادق کی مدح قرار دیا ہے۔

خدانے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی یعنی علامت قرار دے دی کہ یہ خاص میرے لئے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ہیں یعنی ماسوا اللہ کوئی چیز ان کی نظر میں آتی ہی نہیں اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے یعنی وہ محبت کی سختیوں کو جھیل رہے ہیں اور پھر عذاب عذوبت سے بھی مشتق ہے جس کے معنی خوشگوار کے ہیں اور محبت کی سختی میں ایک خاص خوشگواری وشیرینی ہوتی بھی ہے۔

(۴) یہ اور اس کے بعد کے چند تاویلات ''بابیت و مرزائیت کا تقابل'' رسالہ میں مولانا مرزا احمد علی صاحب امرتسری نے درج کیے ہیں جن میں کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

باب وبہاء کے تاویلات: ''بُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا وَّكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا۔''

پہاڑ چلائے جائیں اور وہ پراگندہ غبار کی طرح نظر آئیں گے''۔ مطلب یہ ہے کہ جب احکام بوسیدہ ہوجائیں گے اور ان سے تاثیر اٹھادی جائے گی اور نئے احکام ان کی جگہ پر قائم ہوجائیں گے تو اس وقت علماء کی باتیں ایسی بے تاثیر ہوجائیں گی کہ وہ لوگوں کی نظروں میں پراگندہ غبار کی طرح ہوجائیں گی مطلب یہ ہے کہ نئی شریعت قائم ہوگی جس کی وجہ سے علماء کی پرانی باتیں تاثیر نہیں رکھتیں (بحر العرفان صفحہ ۲۷)

(۵) وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ (زمر۔۶۷) یعنی ''قیامت کے دن زمین اپنے برکات روک لے گی اور سارے آسمان اپنے برکات لپیٹ دیں گے مطلب یہ ہے کہ دلوں کی زمین اور آسمان جس سے مراد پہلی شریعت ہے۔ وہ لپیٹ یعنی منسوخ کردی جائیں گی یعنی اسلامی شریعت ختم ہوجائے گی اور باب وبہاء کی شریعت جاری ہوگی اور یہ زمانہ قائم آل محمدؑ باب کا ہوگا۔

(۶) ''اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ'' ''یعنی نماز کو آفتاب ڈھلنے سے رات کو اندھیرے تک قائم کرو مطلب اس کا یہ ہے کہ محمد عربی ﷺ کی شریعت کا زمانہ جو ۱۲۶۱ء تک ہے اس وقت تک نماز پڑھو۔ اس کے بعد قائم آل محمد (یعنی باب) ظاہر ہوگا اور اسلامی شریعت منسوخ ہوجائے گی تو نماز پڑھنے کا حکم بدل جائے گا حروف تہجی کے اعداد سے غسق اللیل کے عدد ۱۲۶۱ ہوتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو شریعت محمدیہ کے قائم ہونے کے وقت ۱۲۶۱ سال تک قائم کرو اس کے بعد یہ حکم ختم ہے اس لئے کہ دوسری شریعت نازل ہوگی اور وہ باب کے زمانہ کا وقت ہے

(۷) مرزا غلام احمد لکھتے ہیں ''دَآبَّةَ الْاَرْضِ'' سے مراد وہ علماء اور واعظین ہیں جو آسمانی قوت اپنے میں نہیں رکھتے۔ (ازالہ اوہام۔ ص ۵۰)

(۸): وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ. صاف اس میں جنگ بدر کا ذکر ہے مگر مرزا صاحب قادیانی آیت مذکور کے عدد چودہ سو نکال کر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ماننے والوں کی مدد ہے۔

(اعجاز مسیح۔ص ۱۸۳)

(۹) ''بابیت و مرزائیت کا تقابل'' اس کی مندرجہ مثالوں کے بعد ایک اپنے قریب کی مثال بس اور ملاخطہ کر لیجئے۔ ہم سب کے جانے پہچانے اور میرے خاص طور پر کرم فرما بزرگ مصور فطرت خواجہ حسن نظامی کے مضامین کا مجموعہ ''سی پارۂ دل'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اردو کے بعض امتحانات کے کورس میں داخل ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

''قرآن شریف میں سب سے پہلے الٓمّٓ کا لفظ تم نے پڑھا ہوگا اس میں اشارہ ہے کہ آل محمد ﷺ اس کتاب 'علم' کو جس میں کچھ شک نہیں عالمگیر کرنے کے لئے کھڑی ہوگی۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے جو محمدی آل سے تھا یہ کام شروع کیا اور اب آغا خان جو زمرہ آل رسالت سے ہے اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ (صفحہ ۴۵۵)

ان تفسیرات یا تاویلات میں سے بعض کا تعلق چوتھے درجہ سے ہے یعنی الفاظ کے معانی و مطالب پورے ہو چکنے کے بعد یہ پتہ لگانا کہ اس سے اشارہ کا ہے کی طرف ہے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ الفاظ کے معنی و مطلب سے خارج چیز ہے اس لئے نہ افہام و تفہیم کی حدود اسے اپنے اندر لیتے ہیں اور نہ محاورہ کے اصول اس کو معتبر قرار دیتے

ہیں اس لئے یہ معنی جو اشارتاً نکالے جاتے ہیں انہیں متکلم کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے۔

قرآن مجید میں ایسے اشارات و رموز موجود ضرور ہیں اور یہی وہ ہیں جنہیں ''باطن قرآن'' بتلایا گیا ہے اور ان بطون میں تہہ در تہہ کثرت ہو سکتی ہے اس لئے یہ بھی آیا ہے کہ :اِنَّ الْقُرْاٰنَ سَبْعِيْنَ بَطْناً۔'' (قرآن کے ستّر باطن ہیں کیوں کہ ظاہر قرآن کی بنیاد معانی الفاظ پر ہوتی ہے اور معنی ایک لفظ کے بوقت واحد ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتے ہیں باطن کی بنیاد رموز و اشارات پر ہوتی ہے اور اشارہ ایک چیز سے متعدد امور کی طرف ممکن ہے۔

ظاہر قرآن وہ ہے جس کے متعلق پہلے ہم نے اس پر زور دیا ہے کہ اس کے سمجھنے اور اس پر بنیاد عقیدہ و عمل رکھنے کا سب کو حق ہے بشرطیکہ انسان عربی زبان سے کما حقہ واقف ہو لیکن باطن قرآن اس کے مخصوص اہل ہوتے ہیں اور ہر شخص کو اس میں طبع آزمائی کا حق نہیں ہے کیوں کہ ان اشارات کی تعیین جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے زیادہ تر سامع کی افتاد طبع اور ذہنیت کی تابع ہوا کرتی ہے اور اس لئے عام اشخاص کے کلام میں جب ہم اس قسم کے اشارات کی تعیین کریں تو وہ اکثر واقع کے مطابق نہیں ہوتی بلکہ سوء ظن یا سابق و حال واقعات کیلئے بنیادی جوڑ توڑ کا نتیجہ رہتی ہے اور متکلم کو وہ اشارہ یا تعریض مد نظر نہیں ہوتی جسے ہم نے اس کے سر منڈھ دیا ہے۔

پھر جب معمولی اشخاص کے کلام میں عقل انسانی مکمل رہنمائی نہیں کرتی تو خداوند عالم کے کلام میں یہ غیر مکمل عقول کہاں صحیح نقطہ تک رہبری کر سکتے ہیں۔ لہٰذا غلطی کا ہونا اس میں ناگزیر ہے۔ قرآن میں ایسے رموز و اشارات کی تعیین اور ظاہر لفظ سے آگے معانی پیدا کرنا یقیناً تفسیر بالرائے ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے الفاظ کے ظاہر معنی کو سمجھ کر اس کے مضمون کو بیان کرنا ہر گز تفسیر نہیں ہے کیوں کہ تفسیر کے معنی تو غیر ظاہر کو ظاہر بنانے

کے ہیں۔ یہ اسی پر منطبق ہے جس میں ایک غامض ومخفی امر کا کشف ہوتا ہے اور وہ یہ چوتھی صورت ہے۔

پھر اس کے علاوہ ممانعت تفسیر بالرائے کی ہوئی ہے پہلے مراتب و مدارج جو ہیں ان کی بنیاد محاورات عرب کے تتبع زبان دانی اور واقفیت الفاظ و معنی پر ہے وہ اگر چہ عقل پر موقوف ہے بایں معنی کہ ایک مجنون اس مرحلہ کو بھی ممکن ہے طے نہ کر سکے لیکن ان معانی کی تعیین کسی عقل غور وخوض سے تعلق نہیں رکھتی نہ ان میں رائے کا دخل ہے۔ برخلاف چوتھے درجہ کے کہ وہ نہ تو تتبع لغات پر مبنی ہے اور نہ زبان دانی ووسعت نظر سے متعلق بلکہ پورے طور پر اس میں عقل آرائی اور طبع آزمائی کو دخل ہے کہ ہو نہ ہو، متکلم نے اس کلام سے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے یہ چیز وہ ہے جس سے ممانعت ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک چیز ہے تفسیر بالرائے سمجھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ آدمی قرآن کے الفاظ پر قرآن فہمی کی خاطر نظر ہی نہ کرے کہ اس سے واقعی سمجھ میں کیا آتا ہے بلکہ خود ایک رائے قائم کرلے اور پھر کوشش کر کے آیات قرآن کو ایسے معانی کا جامہ پہنائے جن سے اس کی رائے کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن کو اپنی رائے کا تابع بنا رہا ہے اکثر واعظین کی تفسیر بالرائے یہی نوعیت رکھتی ہے۔ ہم نے جو تفسیر بالرائے کا مفہوم لکھا ہے اسے علمائے فریقین کی تائید حاصل ہے۔

ایک طرف صدر المتالہین شیرازی تحریر فرماتے ہیں:

قد غلب علیٰ طبایع اکثر الناس ان لا معنی القرآن الا ما نقل علی ابن عباس و سایر المُفَسِّرِیْن ومنشاء هجرهم التجاوز عن الظاهر ه المشهور امور كثيرة

اظهرها امران احدهما غلبة احكام الظاهر عليهم وقصور افهامهم عن درك بواطن القرآن واسرار الاٰيات والثانی فی الحديث المشهور حيث لم يفهمو المرادمنه ومامعنی التفسير بالرّائے.

وقال امير المومنين علیہ السلام الا ان يوتی الله تعالیٰ عبدًا افهما فی القرآن فان لم يكن سوٰی حفظ الترجمة المنقول فمامعنی الفهم.

وقال علیہ السلام لوشِئتُ لاوفرت سبعين بعير امن تفسير فاتحة الكتاب وفی رواية من تفسير الفاتحه وتفسير ظاهرها فی غاية الاختصار.

واما قوله من فسّر القرآن برأيه والنهی عنه فيحمل علیٰ احد وجهين الاول ان يكون له فی الشئ رای اليه ميل من طبعه وهواه فتيأول القرآن علیٰ وفق رائيه فيكون قد فسّر برائيه ای رايه حمله علیٰ هٰذا ولولا رايه لما ترجّح عنده هٰذا والوجه الثانی ان يَّتَسَارَعُ الیٰ تفسير القرآن بمجرّد العربية من غير استفسارها بالسّماع والنقل فيما يتعلق بقرا،ته ومافيه من الالفاظ المبهمة ومافيه من الحذف والاضمار والتقديم والتاخير والاختصار

واکثر المفسّرین غیر العرفأ منہم فی ھٰذا الخطر.(مفاتیح الغیب۔۲۳)

بہت سے لوگوں کے ذہن پر یہ بات چھائی ہوئی ہے کہ قرآن کے کوئی اور معنی ہو ہی نہیں سکتے سوائے اس کے کہ جو ابن عباس اور دوسرے مفسرین کی زبانی وارد ہو گئے ہیں اور مشہور سطحی معنی کے دائرہ سے باہر نکلنے کو ممنوع قرار دینے کا سبب بہت سے امور ہیں جن میں زیادہ نمایاں دو باتیں ہیں پہلے خود ان کے ذہن پر سطحیت کا حاوی ہونا اور ان کی سمجھ کا قرآن کی باریکیوں سے کوتاہی اور آیات قرآنی کے اندرونی رازوں سے قاصر ہونا اور دوسرے وہ مشہور حدیث کہ انہوں نے اس کے مقصد کو صحیح طور پر سمجھا نہیں اور ان کے ذہن میں نہیں آیا کہ تفسیر بالرائے کے معنی کیا ہیں۔حالانکہ جناب امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے کہ سوا اس کے کہ اللہ کسی بندہ کو قرآن کی سمجھ عطا کرے تو اگر بس سنے سنائے ترجمہ کا یاد کر لینا ہی ہے تو قرآن فہمی کے معنی کیا ہیں۔

اور حضرتؑ نے فرمایا اگر میں چاہوں تو ستّر اونٹ فاتحۃ الکتاب اور ایک روایت میں فاتحہ کی تفسیر سے بھر دوں حالانکہ ظاہری مفہوم کی سورۂ حمد کی تفسیر انتہائی مختصر ہے۔

رہ گیا یہ ارشاد کہ جو قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرے اور اس کی ممانعت تو اسے دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پر محمول ہونا چاہئے ایک یہ کہ کسی معاملہ میں اس کی ایک رائے ہے اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو چکا ہے تو وہ قرآن کی تاویل اس طرح کرتا ہے جو اس کی رائے کے موافق ہو اس طرح

وہ تفسیر اپنی رائے کے سبب سے کر رہا ہے یعنی اس کی رائے اس تفسیر کی محرّک ہوئی ہے اور اس کی رائے نہ ہوتی تو یہ پہلو اس کی نظر میں مرجح نہ ہوتا دوسرے یہ کہ صرف عرب دانی کے سہارے سے وہ تفسیر قرآن جھٹ پٹ کر دیتا ہے بغیر اس کے کہ اس کے حل طلب الفاظ کی تشریح اور مبہم کلمات کی توضیح میں نیز جو اس میں حذف یا اضمار یا تقدم و تاخر یا اختصار ہے ان سب میں اور باخبر علمائے سلف کے تشریحات پر بالکل نظر نہ کرے اور سوا صاحبانِ معرفت کے اکثر مفسرین اس خطرہ سے دو چار رہتے ہیں۔

دوسری طرف اہلسنت میں سے علامہ نیشاپوری رقمطراز ہیں:

ذکر العلماء ان النہی عن تفسیر القرآن بالراے لا یخلوامان یکون المراد بہ الاقتصار علی المنقول والمسموع وترک الاستنباط او المراد بہ امر ٫اخر وبا طل ان یکون المراد بہ ان لا یتکلّم احد فی القرآن الا بما سمعہ فان الصحابۃ قد فسّروا القرآن واختلفوا فی تفسیرہ علیٰ وجوہ ولیس کل ما قالوہ سمعوہ کیف وقد دعا النّبی ﷺ لابن عباس اَللّٰھُمَّ فَقِّھْھُمْ فی الدّین وعلمہ التاویل فان کان التاویل مسموعا کالتنزیل فما فائدۃ تخصیصہ بذالک وانّما النّھی یحمل علیٰ وجھین احدھما ان یکون لہ فی الشئ رای والیہ میل من طبعہ وھواہ فَیُاَوِّل القرآن علیٰ وفق ھواہ لیحجّ علیٰ تصحیح

غرضه ولو لم يكن له ذالك الراى والهوىٰ لَا يُفْهَمُ له
من القرآن ذالك المعنى وهٰذا قد يكون مع العلم بأن
المراد من الاية ليس ذالك ولٰكن يلبس علىٰ خصمه
وقد يكون مع الجهل وذالك اذا كانت الايته محتملة
فميل فهم الى الوجه الذى يوافق غرضه ويرجح ذالك
الجانب برأيه وهواه ولولا رايه لما كان يترجّح عنده ذالك
الوجه وقد يكون له غرض صحيح فيطلب له دليلا من
القرآن ويستدل عليه بما يعلم انه ما اريد يه كمن
يدعوا الىٰ مجاهدة القلب القاسى فيقول المراد بفرعون
فى قوله تعالىٰ اِذْهَبْ اِلىٰ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى هو النفس
الوجه الثانى ان يتسارع الى تفسير القرآن بظاهر
العربية من غير استظهار بالسماع والنقل فيما يتعلق
بغريب القرآن و ما فيه من الالفاظ المبهمة
والاختصار والحذف والاضمار والتقديم والتّاخير
فالنقل والسماع لابدّ منه فى ظاهر التفسير اولا ليتقى
به مواضع الخلط ثم بعد ذالك يتبع التفهيم والا
ستنباط وما عدا هٰذين الوجهين فلا يتطرق النهى اليه
ما دام على قوانين العلوم العربيّة والقواعد الاصلية

والفرعيّة.
علماء نے کہا ہے کہ تفسیر بالرائے کی ممانعت سے یا تو یہ مقصود ہے کہ صرف
سابق سے سنے جاتے ہوئے تشریحات پر اکتفاء کرے اور اپنی ذہنی
صلاحیتوں سے حقیقت کے سمجھنے میں بالکل کام نہ لے یا اس سے مقصود کچھ
اور ہے؟ وہ تصور بالکل غلط ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص قرآن کے
بارے میں کوئی بات نہ کہے سوا اس کے جو اس کے کانوں تک پہنچ چکا ہے
اس لئے کہ صحابہ نے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے اور ان میں تفسیر میں
اختلاف اقوال بھی نظر آتا ہے اور ایسا نہیں ہے کہ جو بھی انہوں نے زبان
سے کہا ہے وہ ان کے گوش زد ہی ہوا ہو اور یہ کیوں کر ہو سکتا ہے جبکہ حضرت
پیغمبرؐ خدا نے ابن عباس کے لئے دعا کی کہ خداوندا اسے دین کے بارے
میں سمجھ اور اسے تاویل کا علم عطا کر۔ اب اگر تاویل بھی مثل تنزیل کے سننے
سے وابستہ ہوتی تو علم تاویل کی دعا کو ان سے مخصوص کرنے کا فائدہ کیا ہوگا
لہٰذا ممانعت کو دو میں سے کسی ایک پہلو پر محمول کرنا چاہیے ایک یہ کہ اس کی
کسی معاملہ میں کوئی رائے ہو اور اس کی طبیعت کا رجحان ہو تو وہ قرآن کی
تاویل اپنی خواہش کے موافق تراشے تاکہ اپنی مطلب برآری کے لئے
قرآن سے استدلال کر سکے اور اگر اس کا یہ رجحان طبع نہ ہوتا تو یہ معنی الفاظ
قرآن سے اس کے ذہن میں نہ آتے اور یہ کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ اس
شخص کو خود معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا یہ مقصد نہیں ہے لیکن وہ اپنے مدمقابل کو
دھوکا دینا چاہتا ہے اور کبھی ناواقفیت کی صورت سے ہوتا ہے اور یہ اس وقت
کہ جب آیت میں احتمال اس مفہوم کا ہوتا ہے تو اس کے ذہن کا رجحان اسی

پہلو کی طرف ہو جاتا ہے جو اس کے مطلب کے موافق ہے اور اس پہلو کو اس کی رائے اور خواہش کی وجہ سے ترجیح ہو جاتی ہے اور اگر اس کی یہ رائے نہ ہوتی تو اس کے ذہن میں اس رائے کو ترجیح نہ ہوتی اور کبھی اس کی غرض کوئی صحیح ہوتی ہے اور اس کے لئے قرآن سے دلیل تلاش کرتا ہے اور اس پر استدلال کرتا ہے ایسی آیت سے جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ یہ اس کا مطلب نہیں ہے جیسے کوئی نفس امارہ کے مقابلہ کی دعوت دینا چاہتا ہو اور کہے کہ اس آیت میں کہ ''فرعون کی طرف جاؤ اس نے بڑی سرکشی اختیار کر رکھی ہے'' فرعون سے مراد نفس امارہ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ تفسیر قرآن میں بس عربی زبان کے پہلو کو سامنے رکھ کر جلد بازی سے کام لے۔ اور لغات قرآنی کے حل اور مبہم الفاظ کی تشریح اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے اور کچھ اجزاء محذوف ہیں اور ضمیروں کی تعیین اور مقدم اور موخر کی تمیز میں علمائے سلف کے کلمات پر بالکل نظر نہ کرے یہ درست نہیں ہے کیوں کہ سب سے پہلے اب تک کے مفسرین کے کلمات کو دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ غلطیوں سے بچ سکے پھر اس کے بعد ذہانت اور فکر و استنباط کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ عقل وفہم سے تفسیر کرنے کی ممانعت نہیں ہے جب تک کہ وہ عربی ادب کے قاعدوں کے موافق اور اصولی وفروعی طور پر ثابت شدہ ضوابط کے مطابق رہے۔

ہوسکتا ہے کہ جو اصول پیش کیا گیا ہے اس معیار کے مطابق خود علامہ صدر الدین شیرازی کی تفسیر اکثر مقامات پر حدود سے متجاوز ہو اور اس لئے ہم اسے تفسیر بالرائے میں داخل سمجھیں اور علامہ نیشاپوری نے جو اقوال صحابہ کا حوالہ دیا ہے چوں کہ صحابہ معصوم نہیں ہیں اور ہم ان کے اقوال کو حجت شرعیہ نہیں سمجھتے اس لئے ممکن ہے خود ان

کے بعض اقوال ہمارے نزدیک تفسیر بالرائے کا مصداق ہوں لیکن اصولی طور پر دونوں مختلف المسلک عالموں نے تقریباً متفق علیہ طور پر جو تفسیر بالرائے کا مفہوم قرار دیا ہے وہ تقریباً نا قابل اختلاف ہے اور اس لئے متاخرین علمائے محققین میں جناب شیخ مرتضیٰ انصاری نے بھی رسائل میں تفسیر بالرائے کا مطلب یہی قرار دیا ہے۔

محکم اور متشابہہ

قرآن مجید نے خود آیات قرآنی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڔ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ (آل عمران۔۷)

اس میں کچھ تو محکم آیتیں ہیں جو اس کتاب میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ متشابہہ ہیں تو وہ جن کے دلوں میں کجی ہے متشابہہ آیتوں کے درپے رہتے ہیں تا کہ فتنہ پردازی کریں اور طرح طرح کی تاویلیں تراشیں حالانکہ اس حصہ کی حقیقی تاویل سے سوا اللہ اور راسخون فی العلم کے کوئی واقف نہیں ہے

یہ تفریق اسی لحاظ سے ہے کہ بعض آیات وہ ہیں جن کے ظاہری معنی لغت عرب اور عام زبان دانی کے اصول اور محاورات کے مطالعہ سے سمجھ میں آجاتے ہیں ان کے سمجھنے اور اتباع کرنے کا ہر شخص کو حق دیا گیا ہے اور ان معانی کا سمجھنا ان سے نتائج کا پیدا کرنا اور ان کے مصداق کا تلاش کرنا تفسیر بالرائے نہیں ہے اور انہی ظاہری معنی کو تنزیل

قرآن کہا جاتا ہے اور کچھ مجمل ومبہم الفاظ ہیں جن کے معانی لغت اور محاورات سے متعین نہیں ہوتے جیسے: مقطعات: الٓر، الٓمٓ، حٰمٓ عٓسٓقٓ وغیرہ یا جو لغوی معنی ہیں وہ عقلاً مراد نہیں ہو سکتے اور اس کے علاوہ کوئی ظاہری مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی رموز واشارات کی حیثیت رکھتے ہیں جیسے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور دَنٰى فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى وغیرہ

ان کے اصلی مفہوم کا حتم وجزم کے ساتھ متعین کرنا راسخون فی العلم کے سوا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

جن آیات کا لغوی حیثیت سے کوئی ظاہری مفہوم ہے اور کوئی قرینہ انکے خلاف نہیں ہے ان میں بھی بطور رمز واشارہ کوئی باطنی معنی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض احادیث میں ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے اور باطن میں بھی باطن یہاں تک کہ بات ستر باطنون تک پہونچتی ہے۔

مذاقِ تصوف رکھنے والے طبقہ نے جو ایران میں عرفاء کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں ان احادیث کی بناء پر باطنی معنی نکالنے میں بڑی طبیعت کے جولانیاں دکھائی ہیں جن میں محی الدین ابن عربی سرخیل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ملا محسن فیض کاشانی کی تفسیر صافی کسی حد تک اس رجحان کی حامل ہے اور تفسیر نیشاپوری میں تقریباً ہر آیت میں پہلے ظاہری معنی کے مطابق تفسیر لکھی گئی ہے اور پھر باطنی طور پر تفسیر میں اشہب قلم کو رواں کیا ہے اور ایک فرقہ نے تو اہل مذاہب میں سے اس پہلو کو اتنا مرکزی نقطہ نظر بنایا کہ اس کا نام فرقہ باطنیہ ہو گیا۔ بوہرہ اور آغا خانی اسمعیلی جماعتیں اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہیں ان میں بھی ایک حلقہ ایسا ہے جو باطن کے ساتھ ظاہر کو نظر انداز نہیں کرتا ان سے کسی حد تک ہمیں بھی اتفاق ہو سکتا ہے لیکن دوسرا گروہ ہے جو باطن کو لے کر ظاہر کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے ان سے کسی بھی منزل میں اتفاق ہو

نا تقریبا ناممکن ہے۔

ایسے آیات قرآن مجید کہ جن کا ظاہری مفہوم لغت کے اصل موضوع کا معنی کے لحاظ سے مراد ہونا عقلاً غیر ممکن ہے ان میں انتہا پسندانہ نقطہ یہ ہے کہ عقل کو صدائے فریاد بلند کرنے دو تم وہی معنی مانو جو بتقاضائے لغت قرآن وحدیث سے سمجھ میں آتے ہوں اس سے اسلام میں فرقہ مجسمہ کا وجود ہوا جس نے ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' کی بناء پر اللہ کو جسمانی طور پر عرش پر بیٹھنے والا اور يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ وغیرہ کی بناء پر اعضاء وجوارح پر مشتمل بیان کیا اور نجدی وہابی جماعت کے پیشوائے اعظم ابن تیمیہ اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ دوسرے اہل سنت جو مجسمہ ہونے سے بچنا چاہتے ہیں اکثر ان آیات و احادیث کو ظاہری معنی پر قرار رکھتے ہوئے ''بِلَاكَيْفَة'' کے قائل ہیں یعنی ان کا تصور یہ ہے کہ استوٰی کے معنی بیٹھنے ہی کے لو مگر بیٹھنے کی کیفیت کیا ہے؟ اسے کہو کہ ہم سمجھ نہیں سکتے ید کے معنی ہاتھ ہی کے کہو مگر ہاتھ اس کے کس طرح ہیں؟ اسے نہ سوچو۔ اس طرح وہ بخیال خود تجسیم سے محفوظ رہتے ہیں چنانچہ روایت کے بھی وہ آنکھوں سے دیکھنے ہی کے معنی میں قائل ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ اس سے جسم ہونا لازم نہیں آتا اور اس لئے باوجودیکہ یہ بات ہمارے نزدیک خلاف عقل ہے اور روایت بلا شبہ مستلزم تجسیم ہے پھر بھی ہم عام طور پر اہلسنت کو مجسمہ نہیں کہہ سکتے اس اصول کی بناء پر کہ لازم مذہب مذہب نہیں ہے۔

اس کے برخلاف دوسرے سرے پر نقطہ نظر فلاسفہ وحکماء کا ہے جو ایسی تمام چیزوں کو جن کی نوعیت کا سمجھنا ہماری عقل کے احاطہ سے خارج ہے صرف تخئیل وتمثیل پر مبنی قرار دیتے ہیں یہاں تک کہ نعیم جنت اور عذاب دوزخ کے تذکروں کو بھی مثالی حیثیت دیدیتے ہیں۔

یہ نقطہ نظر اس لئے ناقابل قبول ہے کہ اس طرح کسی بھی واقعہ کے اظہار کا

دروازہ بند ہو جائے گا کیوں کہ ہر متکلم کے الفاظ میں یہ پہلو پیدا کیا جا سکتا ہے کہ یہ صرف محاکات کی حیثیت رکھتے ہیں تو پھر کسی واقعہ کو اگر سچ مچ بیان کرنا ہو تو الفاظ کہاں سے آئیں؟

صحیح نقطہ نظر جو اعتدال کا نقطہ ہے یہ ہے کہ جب الفاظ کے ظاہری معنی ایسے ہوں کہ کوئی قرینہ لفظی و عقلی ان کے خلاف نہیں ہے تو اس لفظ کا مطلب وہی لینا چاہئے جو لغت و عرف کے لحاظ سے ان الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں لیکن اگر اصلی معنی لفظ کے ایسے ہوں جو عقلاً ممکن نہیں ہیں لیکن محاورات عرفی کے لحاظ سے کوئی قریب ترین مجازی معنی الفاظ کے موجود ہیں جو عقلاً بھی درست ہو سکتے ہیں۔ تو اس لفظ کو ایسے معنی پر محمول کرنا بھی بلا تکلف صحیح ہے جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى کا مفہوم بجائے تمکن جسمانی کے جو عقلاً غیر ممکن ہے غلبہ و استیلا بحیثیت قدرت کے معنی میں اور يَدَاهُ مَبْسُوْطَتَانِ کے معنی جسمانی ہاتھوں کے بجائے جو عقلاً خدا کے لئے نہیں ہو سکتے اقتدار و اختیار کے معنی میں لینا جو عرف عام کے بالکل مطابق ہیں اس صورت میں بھی الفاظ قرآن کو مجمل نہیں سمجھا جا سکتا اور توقف یا تحیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اگر ایسے کوئی عرفی معنی اس لفظ کے موجود ہی نہ ہوں اور ان کا مفہوم صرف اشارات و کنایات ہی کے طور پر ذہن سے نکالا جا سکتا ہے جو مختلف ذہنی پیمانوں کے لحاظ سے مختلف ہو سکتا ہے تو یہ وہ متشابہات ہوں گے جن کے اصل معنی کو راسخون فی العلم کے حوالے کرنا چاہئے اور ان میں ذہانت سے کچھ پہلو سمجھ میں آئے تو اسے بطور احتمال امکانی طور پر کہنا درست ہے لیکن حتم و جزم کے ساتھ کچھ کہنے کی جراءت نہ کرنا چاہئے۔

تعجب ہے کہ علامہ صدر الدین شیرازی جو دور آخر میں فلاسفہ و اہل معقول کی صف اول میں ہیں اگرچہ نتیجہ وہ بھی متشابہات میں اسی مسلک سے متفق معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اس ظاہر پرستی سے بہت حد تک راضی نظر آتے ہیں جیسے اللہ کی تجسیم ایسے کفر عظیم کا

تصور پیدا ہوا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ممکن ہے اپنی تفسیر میں خود ان کا قلم اس جادہ سے کسی ایک یا بہت جگہ ہٹ گیا ہو مگر اصولاً وہ ہمارے بیان کردہ نقطہ اعتدال کو پیش کرتے ہوئے بھی ظاہری مفاہیم کو باقی رکھنے کے شدت کے ساتھ حامی معلوم ہوتے ہیں۔

جسے اپنی کتاب مفاتیح الغیب صفحہ ۲۴، ۲۵ (مطبوعہ ایران) میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

سابق اور حال تبصرہ کے بیانات کی رُو سے غور و فکر کرنے کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید کا ترجمہ ظاہری معنی الفاظ کے تحت اللفظی معنی کہنے کا حق ہر واقف زبان عربی کو ہے جسے عربی الفاظ کے معانی پر اتنا عبور حاصل ہو کہ وہ لغت کی مدد سے سہی ہر لفظ کے معنی سمجھ سکتا ہو اور قرائن مقام کی مدد سے مشترک الفاظ کے متعدّد معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعیین کر سکتا ہو لیکن ایسے اشخاص کا ترجمہ قرآن کے لئے کھڑا ہونا جو عربی کے محاورات سے اس طرح واقف نہیں ہیں خود غلطی میں مبتلا ہونا اور دنیا کو گمراہی میں ڈالنا ہے افسوس ہے کہ عموماً تراجم قرآن جو رائج ہیں ان میں متعدد ایسے ہی اشخاص کے قلم سے ہیں اور اس لئے ان کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۲) قرآن مجید کے معانی و مطالب میں جہاں تک ظواہر قرآن کے دائرہ کے اندر ہیں ہر شخص کو غور و فکر کرنے کا حق اور نتائج نکالنے کی گنجائش ہے اور قرآنی آیات سے ان کے ظواہر معانی کی بناء پر استدلال بھی ہر شخص کے لئے صحیح ہے بشرطیکہ اس میں اصول محاورہ و تکلم کا لحاظ رکھا جائے اس کے علاوہ عام و خاص مطلق و مقید منسوخ و ناسخ اور مجمل و مبین کا لحاظ بھی ضروری ہے بغیر اس کے تفسیر لکھنے کا حق نہیں ہے۔

(۳) قرآن کے مضامین پر غور و فکر کرنے سے جو رموز و اسرار پیدا ہوں علمی

نکات برآمد ہوں، فلسفی انکشافات کا پتہ چلے اور ادبی محاسن کا اندازہ ہو، انہیں سمجھنا اور ان کا نمایاں کرنا مستحسن خدمت ہے جس کے مقبول ہونے کے لئے معانی و مطالب کو بیان شدہ معیار پر سمجھنے کے ساتھ ذوق سلیم قوت نظر اور ایک حدتک ذہانت و ذکاوت کی ضرورت ہے ہاں اس قسم کی نکتہ پردازی و موشگافی بارگاہ تفسیر میں اسی وقت مقبول ہو سکے گی جب اس علمی نکتہ رمز یا انکشاف کے ثابت کرنے کے لئے اصل معنی قرآن میں کوئی تغیر کرنے کی ضرورت نہ پڑی ہو اور اس کے انہی معانی سے کہ جن کرنے کا معیار ابھی بیان ہو چکا ہے، وہ نکات ورموز پیدا ہوئے ہوں۔

(۴) قرآن مجید کے اصلی معانی و مطالب کو محفوظ رکھنے کے ساتھ ان کے مصداق صحیح کا پتہ لگانے میں اگر تاریخی جغرافیائی یا سائنس کے معلومات اور جدید انکشافات سے مدون رہی ہو تو ان معلومات سے مدد لے کر قرآنی آیت کے صحیح مصداق کا پتہ چلانا کوئی نامناسب امر نہیں ہے۔

(۵) ''مُتَشَابِهَات'' یعنی ایسے آیات میں جن کے ظاہری معنی نمایاں طور پر متعین نہیں ہیں عقل سے کام لے کر اشارات و رموز تجویز کرنے کا بطور حتم و جزم سوا ''راسخون فی العلم'' کے کسی کو حق نہیں ہوسکتا۔

بے شک اگر عقل پر زور دے کر کچھ اشارات بطور امکان و احتمال پیدا کئے جائیں تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا بلکہ اس کا دروازہ اس وقت بھی بند نہیں ہوگا کہ جب کسی حدیث نے کسی رمز و اشارہ کی تشریح کر دی ہو۔ اس لئے کہ ایک خاص اشارہ کی تشریح ہو جانے سے انحصار ثابت نہیں ہوتا جب کہ خود احادیث سے ثابت ہے کہ بواطن قرآن میں کثرت ہوتی ہے لہٰذا یہ امر غیر ممکن نہیں ہے کہ اور پہلو بھی پائے جاتے ہوں جن کا احتمالی طور پر ذاتی غور وفکر سے استخراج کیا جا سکے۔

(۶) وہ آیات جن کے اصلی معنی جو باعتبار لغت ہیں، قرینہ عقلی یقینی کی بناء پر

مراد نہیں لئے جا سکتے جیسے الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ وغیرہ ان میں معنی حقیقی کو ترک کرنے کے بعد اگر اصول محاورہ کے ماتحت کوئی قریبی معنی پائے جاتے ہوں جیسے ''ید'' کے معنی ''ہاتھ'' نہ ہونے کے بعد ''قدرت و طاقت'' تو یہ ''متشابہات'' نہ سمجھے جائیں گے ہاں جب ایسے کوئی معنی موجود نہ ہوں تو آیت متشابہات میں سے قرار پائے گی۔ ان میں اگر کوئی بات سمجھ میں آئے تو اس کا بطور احتمال ظاہر کرنا درست ہے۔ وثوق کے ساتھ بغیر راسخون فی العلم کی سند کے کچھ کہنا صحیح نہیں ہے۔

(۷) وہ الفاظ جن کے ظاہری معانی موجود ہیں ان میں بطور رمز و اشارہ کوئی معنی احتمالی طور پر بتائے جا سکتے ہیں لیکن حتم و جزم کے ساتھ نہیں -- اس لئے کہ تاویل آیات کی راسخون کا حصہ ہے۔

(۸) کسی تاویل کے احادیث میں وارد ہونے کے بعد بھی الفاظ قرآنی کے جو اصلی معنی باعتبار لغت ہیں وہ نظر انداز نہیں ہوں گے بلکہ اعتقاد و عمل جس سے بھی ان کا تعلق ہے اس کا ان کے مواقف برقرار رکھنا ضروری ہوگا۔

یہی بہت بڑا فرق ہے معنی مجازی میں کہ جو لفظ کے اصلی معنی کو چھوڑ کر مراد ہوتے ہیں اور معنی رمزی میں کہ جو بطور اشارہ مقصود ہوتے ہیں پہلی صورت میں اصلی معنی کا نظر انداز کرنا ضروری ہوتا ہے جیسے ''اسْتَوٰی'' کے معنی تمکین جسمانی کے اور ''یَدٌ'' کے معنی جسمانی ہاتھ کے لیکن دوسری صورت میں اصلی معنی بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کی پابندی لازم ہوتی ہے۔

اسے اپنے روزمرہ کے محاورات پر نظر کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً: ایک شخص نے کہا کہ ''فلاں محفل میں جو گیا'' دیکھا شیر بیٹھا ہے، محفل کا ذکر کرنا قرینہ ہے اس کا کہ شیر سے کوئی بارعب و ہیبت انسان مراد ہے اصلی شیر نہیں ہے اب اگر اس متکلم نے کسی دن یہ کہا کہ میں نے سب جانور دیکھے شیر آج تک نہیں دیکھا، تو اس پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ

تم نے ابھی اس دن کہا تھا کہ میں نے شیر دیکھا۔اس لئے کہ اس دن شیر سے مراد بقرینہ جب شیر صفت انسان قرار ابھی دیا گیا تو اس کا تعلق اس جانور سے نہیں رہا جس کا نام شیر ہے۔اس لئے وہ ثبوت اور نفی کے خلاف نہیں ہے جو اس کے کلام میں ہے۔

اس کے برخلاف دوسرا جملہ ملاحظہ: ایک شخص کسی ایسے انسان پر تعرض کرتے ہوئے جس کی آنکھوں میں بصارت کم ہے یہ کہے کہ خدا کے فضل سے میری آنکھوں میں بصارت کم نہیں ہے۔

اس سے کہنا تو مقصود یہی ہے کہ اس دوسرے شخص کی آنکھوں میں بصارت کی کمی ہے لیکن اس کی بناء پر وہ خود اپنے الفاظ سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا یعنی اس کا یہ کہنا جب ہی درست ہوگا۔جب واقعی خود اس کی آنکھوں میں بصارت کی کمی نہ ہو لیکن اگر تھوڑی دیر میں اس نے خود ضعفِ بصارت کی شکایت کی تو اس کا وہ کلام لغو اور مہمل ہو جائے گا اس کی وجہ یہی ہے کہ تعرض و اشارہ کی صورت میں اصل معنی نظر انداز نہیں ہوتے بلکہ ان کے محفوظ رہتے ہوئے اشارہ کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔

قرآن میں ان دونوں کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) احادیث میں بتایا گیا ہے کہ قرآن میں بہت باتیں إِيَّاكِ أَعْنِي وَ اسْمَعِي يَا جَارَة کے طور پر کہی گئی ہیں یعنی خطاب کسی سے ہے اور مقصود کسی اور کو سنانا ہے ۔جیسے یہ آیت:

لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخٰسِرِينَ.

(زمر۔۶۵)

اگر آپ شرکت اختیار کیجئے تو آپ کے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں گے اور آپ گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوں گے۔

یہ تنبیہ حقیقۃً رسول سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسرے اشخاص سے متعلق ہے جسے رسول پر رکھ کے وارد کیا گیا ہے اب کوئی شخص استدلال کرنا چاہئے یا اعتراض کرے کہ کلمہ ''ان'' عربی میں محتمل الوقوع بات کے لئے آتا ہے رسول سے کہنا کہ لئن اشرکت پتہ دیتا ہے کہ آپ سے معاذ اللہ شرکت کے وقوع کا احتمال تھا اور یہ آپ کی عصمت کے خلاف ہے تو یہ استدلال یا اعتراض درست نہ ہوگا۔اس لئے یہ خطاب جب دوسروں کی تنبیہ کے لئے ہو گیا تو اس کے نتیجہ کا تعلق رسولؐ کے ساتھ باقی ہی نہیں رہا بلکہ دوسروں سے ہو گیا۔

(۲) قرآن میں بہت جگہ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ یا إِقَامِ الصَّلٰوةِ وغیرہ ہے جس کے معنی ادائے نماز کے ہیں اگر بعض روایات میں یہ نظر سے گزرے کہ اقامہ صلوٰۃ سے اشارہ ہے ولایت کے عقیدہ کی طرف جو سبب درستی عبادات ہے تو بلاشبہ یہ اشارہ اپنی جگہ درست ہوگا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ یہ آیت وجوب نماز کی دلیل ہی نہ رہے اور کہا جائے کہ اس سے تو ''ولایت ائمہ معصومین'' مراد ہو گئی۔اب اس کو نماز سے کیا تعلق یہ مغالطہ ہوگا جس کا واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔اس آیت میں یقیناً نماز کا حکم ہے اور اشارہ وجوب ولایت کی طرف بھی ہوسکتا ہے۔

یہاں یہ نہیں ہے کہ پہلے معنی نظر انداز ہو گئے اور اب بطور استعمال لفظی دوسرے معنی مراد ہوں۔

تاویل آیات کی مختلف اقسام

آیات قرآن کی تفسیر و تاویل جو احادیث میں مذکور ہوتی ہے اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں جن میں اکثر اشخاص کو اشتباہ ہوتا ہے اور اس لئے نتائج کے اخذ کرنے میں دھوکا کھاتے ہیں۔

(۱) بعض احادیث ایسی ہوئی ہیں کہ ان میں کسی آیت کے شان نزول اور مورِدِ ورود کی تعین کی جاتی ہے کہ یہ آیت کس موقع پر اتری تھی اس قسم کی احادیث سے ان آیت کے عموم پر جب کہ الفاظ عام ہوں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا بے شک اگر الفاظ آیت ہی کسی خاص شخص کی طرف اشارہ کر رہے ہوں ان میں خود ہی عموم پایا نہ جاتا ہو تو حدیث اس وقت میں اس تاریخی انکشاف کی حیثیت رکھتی ہوگی کہ یہ شخص خاص کون تھا جس کے بارے میں یہ آیت اتری ہے دونوں قسموں کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ.

(السجدہ۔ ۱۸)

کیا جو مومن ہو،وہ مثل اس کے ہے کہ جو فاسق ہو۔؟ نہیں یہ سب برابر نہیں ہیں۔

احادیث سے ثابت ہے کہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابیطالبؑ سے ولید بن عقبہ نے بحث کی اور اپنی بلندی جتائی۔ اس پر یہ آیت اتری جس میں مومن سے مراد حضرت علیؑ اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ہے۔ لیکن اس خصوصیت کے معلوم ہونے کے بعد بھی الفاظ آیت سے جو کلیہ سمجھ میں آتا ہے کہ مومن اور فاسق عزت واحترام اور حقوق میں مساوی نہیں سمجھے جاسکتے اپنی جگہ قائم ہے۔

اس ولید کے بارے میں دوسری آیت جو قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا.

اے ایمان لانے والو! اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو

(حجرات ۶)

یہ بھی محل آیت کے خاص ہونے کے باوجود حکم عام کی حامل ہے کہ فاسق کی خبر کو معتبر نہیں سمجھنا چاہیے۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَاۗىِٕكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ (بقرۃ۔ ۱۸۷)

جائز ہے تمہارے لئے شب ماہ صیام مقاربت کرنا اپنی عورتوں کے ساتھ وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لئے خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کیا کرتے تھے اب اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی اور تمہیں معاف کر دیا

اس آیت میں پہلا جزء پہلی قسم سے تعلق رکھتا ہے اس میں عموم ہے اگر چہ مورِدِ نزول معیّنا شخاص سے متعلق تھا لیکن حکم عمومی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ کے لئے قائم ہے۔ دوسرا جزء کہ "خدا کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے رہے ہو، مگر خدا تم کو معاف کرتا ہے"۔ یہ بیان واقعہ ماضی کی حیثیت رکھتا ہے جو مخصوص افراد سے متعلق ہے جن کے اسماء روایات میں درج ہیں اس سے کوئی عمومی کلیہ نہیں برآمد ہوتا جسے مجرمین اپنے لئے گزشتہ جرائم کے عفو کا پروانہ قرار دیں۔

اس قسم میں کبھی الفاظ عام ہوتے ہوئے بھی قرینہ مقام اور سیاق کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خاص اشخاص سے متعلق ہے اور ان میں کسی حکم عام کا اعلان نہیں ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمْ رٰکِعُوْنَ۔ (مائدہ۔ ۵۵)

تمہارا حاکم اللہ ہے اور اس کا پیغمبر اور وہ ایمان والے جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں۔

یہاں ایسا ہی ہے کہ الفاظ کے عام ہوتے ہوئے سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص منصب کا اعلان ہے جس میں نام کے بجائے تعارف شخصیت کے طور پر یہ اوصاف لائے گئے ہیں۔

لیکن بعض مقامات پر احادیث کسی وسیع عنوان کی فرد اکمل کا پتہ دیتے ہیں یہ آیات پہلی ہی قسم میں دخل ہوں گے یعنی وہ اپنے عموم پر باقی رہیں گے اور ان میں فرد کے ساتھ اختصاص پیدا نہ ہوگا جیسے بعض روایات میں ہے کہ جہاں جہاں قرآن مجید میں یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ ہیں، اس سے مقصود ائمہ معصومینؑ ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ حضرات اس مفہوم کے مصداق اتم واکمل ہیں لیکن اس سے بعض گمراہ اشخاص کا یہ گمراہ کن نتیجہ نکالنا کہ جو جو احکام اس عنوان سے مخاطب کر کے کہے گئے ہیں وہ تمام احکام ائمہ سے مخصوص تھے اور ان کا تعلق ہم سے نہیں ہے بالکل غلط ہے اس کے لئے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کی لفظ کے استعمال کو اس مقام پر دیکھنا چاہئے جہاں بعد والا حکم ائمہ سے متعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (نساء۔ ۵۹)

اے ایمان والا اللہ کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور صاحبان امر کی جو تم میں سے ہیں

یہاں اگر یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کو ائمہ سے مخصوص کر دیا گیا تو ہوا اولی الامر

کون ہوں گے جن کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے ایک آیت اس طرح ہے کہ:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (نساء۔ ۱۳۶)

اے ایمان لانے والوں ایمان اختیار کرو اللہ اور اس کے پیغمبرؐ پر۔

یہاں ماننا پڑے گا کہ پہلے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد اقرار ایمان کرنے والے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ ہے کہ وہ دل سے واقعی ایمان اختیار کریں اور ایسی ہی متعدد آیتیں قرآن مجید میں ہیں جن سے معصومینؑ کا مراد لیا جانا ان کی شان بلند کے خلاف ہے۔

اور اسی سے بہت سے ان روایات کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے جن کے متعدد آیات میں احکام کا تعلق خاص ذات سے نہیں ہے لیکن ان روایات میں یہ ہے کہ یہ آیات شان امیر المومنینؑ میں ہیں۔

علامہ صدر الدین شیرازی فرماتے ہیں:

ومن ھٰذا القبیل ما یروی من الائمۃ علیہم السلام ان الصراط المستقیم ھو امیر المومنین علیہ السلام والنَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ ھُمْ فِیْہِ مُخْتَلِفُوْنَ امیر المومنین وان اِنَّہٗ فِیْۤ اُمِّ الْکِتٰبِ لدینا لعلی حکیم ھو علی بن ابیطالب وان قولہ تعالیٰ وبِئْرٍ معطلۃ وقصر مشید، الاول ھو الامام الصامت والثانی ھو الامام الناطق وامثال ذٰلک فی اٰیت کثیرۃ۔

(شرح اصول کافی طبع ایران۔ ص۴۰۳)

اسی طرح کی وہ روایتیں ہیں جو ائمہ معصومینؑ سے وارد ہوئی ہیں کہ صراط

مستقیم جناب امیرالمومنینؑ ہیں اور نباءِ عظیم (بڑی خبر) جس میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں حضرت امیرالمومنینؑ ہیں اور یہ کہ انہ فی الکتب والی آیت میں علی حکم سے مراد حضرت علی بن ابی طالبؑ ہیں اور یہ آیت جس کے معنی ہیں ''بند کنواں'' اور ''مضبوط محل'' اس میں پہلے سے مراد وہ امام جو زبان کھول سکے اور اس طرح کا مضمون بہت سی آیتوں میں ہے۔

اسی سے ان روایت کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ثلث قرآن شان امیرالمومنینؑ میں نازل ہوا۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ جہاں جہاں بھی کوئی صفت مدح قرآن مجید میں ہے اس کے مفہوم کی فرد نمایاں امیرالمومنینؑ ہیں اسی طرح آیات مذمت کا تعلق اعداء اہلبیتؑ کے ساتھ بحیثیت امتیازی افراد مصداق کے ہے چاہے وردوان کا امم سابقہ کے کفار و فجار کے سلسلہ میں ہوا ہو۔ بے شک بعض احادیث ایسے ہوتے ہیں جن میں کسی عموم آیت میں تخصیص یا اطلاق میں تقئید کی جاتی ہے یہ احادیث اگر بجائے خود شرائط حجیت کے حامل ہوں تو یقیناً عموم یا اطلاق آیت کی تخصیص یا تقئید کا باعث ہوں گے جیسے قرآن میں زوجہ کی میراث بتاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ. (نساء ۱۲)

اور ان کے لئے چوتھا حصہ ہے تمہارے متروکہ کا۔ اگر تمہارے لئے اولاد موجود نہ ہو اور اگر تمہارے اولاد ہو تو انہیں آٹھواں حصہ ملے گا۔

اس میں ماترکتم یعنی متروکہ کا لفظ مطلق ہے جس میں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد دونوں قسمیں داخل ہیں لیکن جب احادیث معتبرہ سے ثابت ہو جائے کہ زوجہ کو غیر منقولہ میں بالکل یا عین جائیداد میں حصہ نہ ملے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اطلاق آیت

میں ایک قید ثابت ہوگئی۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ متعدد آیات قرآن سے ملا کر کوئی مطلب نکالا جائے اس کی دو نوعتیں ہیں ایک یہ کہ ان دو یا اس سے زیادہ آیتوں میں سے کسی میں کوئی معنوی تصرف نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک اپنے اپنے ظاہری معنی پر برقرار رکھی جائے اور پھر بھی آیات کے مجتمع ہونے سے کوئی ایسا مطلب نکل آتا ہے جو ان میں سے کسی ایک آیت میں باعتبار الفاظ مذکور نہ تھا۔ یہ صورت درست ہے اور جو مطلب اس طرح سے پیدا ہو یقیناً قابل اعتبار ہے

مثال: قرآن مجید میں ایک جگہ مدت رضاع یعنی بچوں کو دودھ پلانے کی میعاد مقرر کی گئی ہے دو برس

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ.

(بقرۃ۔ ۲۳۳)

ماؤں کا حق ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دو برس تک دودھ پلائیں۔

دوسری جگہ حمل اور رضاعت کی مجموعی مدت کم از کم ڈھائی برس بتائی گئی ہے۔

وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ۚ (احقاف۔ ۱۵)

اس کے حمل اور دودھ بڑھائی کی سب مدت تیس مہینے ہے

جب دونوں آیتوں کو ملا دیا جائے اور تیس مہینے کی مجموعی مدت حمل و رضاعت میں سے دو برس یعنی چوبیس مہینے رضاعت کے منہا کر دیئے جائیں تو حمل کی مدد کے لئے چھ مہینے بچتے ہیں اس سے ثابت ہوا کہ اقل مدت حمل چھ ماہ ہے یہ حکم شریعت قرآن مجید سے مستنبط ہے اگرچہ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں مذکورہ نہیں ہے۔

دوسری قسم یہ ہے کہ یہ نتیجہ اجتماعی ظواہر الفاظ پر مبنی نہ ہو بلکہ دو یا اس سے زیادہ

آیتوں میں سے کسی ایک آیت میں کسی حدیث نے کوئی تاویلی معنی بتائے ہوں انسان اس تاویل کو لے کر دوسری آیتوں میں بھی جہاں اس طرح کا کوئی لفظ مذکور ہوئی وہی معنی قرار دے لے اور اس سے کوئی خاص نتیجہ نکالے یا کسی مشترک لفظ سے ایک جگہ بقرینہ مقام ایک معنی مراد ہوں تو اب جہاں کہیں وہ لفظ بغیر اس قرینہ کے آئے وہاں بھی وہی معنی قرار دیئے جائیں یا ایک جگہ بطور مجاز کسی معنی میں استعمال ہوا اور دوسری جگہ قرینہ مجاز کے مفقود ہوتے ہوئے بھی اسی معنی پر محمول کرے یہ جوڑ توڑ آیتوں کا ہرگز درست نہیں ہے۔

بے شک یہ صحیح ہے کہ ''القرآن یفسّر بعضہ بعضًا '' قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے مگر یہ اسی دائرہ میں ہے جس کا قاعدہ محاورہ وتکلم تقاضا رکھتے ہیں جیسے عام کی تخصیص مطلق کو تقیید اور اضمار کی تعیین۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے عموماً کسی دانش مند متکلم کا ایک وقت کا کلام دوسرے وقت کے کلام کا مبین و شارح قرار پاتا ہے، یہی صورت قرآن مجید میں بھی ہوگی۔ نہ یہ کہ ہر جگہ ایک آیت کا دوسری آیت میں پیوند لگا کر معنی پیدا کر لئے جائیں چاہئے وہ اصول محاورہ کے بالکل خلاف ہوں جیسے ایک جگہ صلوۃ درود کے معنی میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ اصَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (احزاب۔۵۶)

یہاں اس فعل کا اسناد اللہ کی طرف اس کا قرینہ ہے کہ نماز مراد نہیں بلکہ رحمت اور اس کی مناسبت سے بعد میں طلب رحمت مراد ہے۔ اب جہاں یہ قرینہ موجود ہو جیسے: اِنَّ اللّٰہَ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وہاں یہ معنی مراد لئے جائیں گے مگر مخالفین شریعت اب ان آیات کی بناء پر

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اور یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃ اور اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔ اور ایسی ہی بکثرت آیات میں جو صلوۃ اور اس سے مشتق الفاظ ہیں ان سب کو درود کے معنی میں قرار دے کر نماز سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہیں تو سعی نامشکور کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی۔

واعظین و مقررین اس طرح کے بہت جوڑ توڑ کیا کرتے ہیں اس میں قدم قدم پر تفسیر بالرائے ہوتی ہے جو سخت ترین گناہ ہے۔ مختصر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ بڑا نازک ہے۔ اس میں وسعت بھی اتنی ہے جو ان تنگ خیال افراد کے تصور سے آگے ہے جو بالکل تابع لفظ رہنا چاہتے ہیں اور ذرا غور و فکر کر کے جو کوئی حکمت اور نکتہ حقیقت قرآن سے نکالا جائے جو سابق کی کتابوں میں مذکور نہ ہو اسے تفسیر بالرائے کہہ دیتے ہیں اور پھر اس میں تنگی بھی بہت ہے جو ان لوگوں کے حدود تخیل سے بہت تنگ ہے جو قرآن مجید کے آیات کی آنکھ بند کر کے اپنے دل سے تفسیر شروع کر دیتے ہیں اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمیں اس تبصرہ کو اتنے طولانی بنا دینے کی ضرورت پڑی ہم نے اس میں جو اصول قواعد قرار دیئے ہیں انہیں اگر انسان پیش نظر رکھے تو امید ہے کہ وہ نقطہ اعتدال پر قائم رہ کر تدبر فی القرآن کے برکات سے بہرہ مند بھی ہوگا اور تفسیر بالرائے کے عمیق گڑھوں میں گرنے سے محفوظ بھی رہے گا۔

افادات بلاغیؒ

از

مقدمات تفسیر آلاء الرحمٰن

فی

تفسیر القران

جلد اوّل

مبطع ''العرفان صیدا

۱۳۵۱ھ ـ ـ ـ ۱۹۳۳ء

تمہید

حجۃ الاسلام آیت اللہ شیخ محمد جواد بلاغی طاب ثراہ سامرا کے حوزہ علمیہ کے فارغ التحصیل اور آیت اللہ میرزا محمد تقی شیرازی کے حلقہ درس کے فیضیاب فقہ اور اصول میں بھی اس معیار پر فائز تھے جو ایک بلند پایہ مجتہد کا ہوتا ہے مگر آپ نے خاص طور پر دینی ضرورت کا احساس فرما کر ان علوم دینیہ میں مجاہدانہ طور پر زندگی گزاری جن کی جانب عموماً عراق وایران کے مجتہدین توجہ نہیں فرماتے چنانچہ مادّیین اور نصارٰی وغیرہ کی رد میں ''الھدٰی الی دین المصطفیٰ'' اور ''الرحلۃ المدرسیۃ'' اور ''انوار الھدٰی'' وغیرہ ان کی عظیم الشان کتابیں ہیں آخری عمر میں انہوں نے تفسیر قرآن لکھنا شروع کی تھی جو افسوس ہے کہ عمر کی بیوفائی سے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی وہ شام کے شہر صیدا میں زیر طبع تھی جب میں عراق سے مراجعت کر کے ہندوستان آگیا۔

میرے ہندوستان آنے کے بعد ممدوح کی تفسیر کی پہلی جلد طبع ہو کر ہندوستان آئی اور مجھ تک پہونچی جس میں آغاز تفسیر کے قبل ۴۸ صفحات میں کچھ اہم مقدمات تمہیدی حیثیت سے درج کئے گئے ہیں۔ جب میں نے تفسیر لکھنے کا ارداہ کیا تو مستقل جلد مقدمہ تفسیر قرآن کے نام

سے لکھی جو ۲۷۲ صفحات پر مشتمل تھی اس میں بنظر افادیت کچھ مضامین سرکار مرحوم کے زیادہ تر ان کے حوالے کے ساتھ درج کردیئے گئے تھے اسے بعض اہل اغراض نے غلط فہمی پھیلانے کا ذریعہ بنایا۔

اب اس مرتبہ مناسب معلوم ہوا کہ ان مضامین کو اصل کتاب سے خارج کرکے سرکار بلاغی اعلی اللہ مقامہ کے اہم افادات کو آخر میں بطور ضمیمہ شامل کردیا جائے تاکہ حقیقت مشتبہ بھی نہ ہو اور اس کتاب کے ناظرین موصوف کے گرانقدر افادات سے محروم بھی نہ رہیں۔ والسلام

علی نقی النقوی

(۱)

قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت کا ایک خاص پہلو

معجزہ قرآنی کی ایک اہم خصوصیت جو دنیا کے کسی دوسرے معجزہ میں پائی نہیں جاتی یہ ہے کہ اعجاز کے جتنے ارکان ہیں ان سب کو وہ خود اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور مقدمات وقرائن خارجیہ یا صرف عقل پر منحصر نہیں ہیں۔

دوسرے معجزات کی یہ صورت ہے کہ خارق عادت آنکھوں کے سامنے پیش ہو لیکن اس کے معجزہ ہونے میں جتنی باتوں کی ضرورت ہے وہ خود اس میں مضمر نہیں ہیں۔

وہ ایک خاموش مشاہدہ غیبی ہوتا ہے جو اپنی زبان سے یہ اعلان نہیں کرتا کہ میرا ظاہر کرنے والا مدعی نبوت وغیرہ بھی ہے جو ایک خارق عادت کے معجزہ ہونے کا رکن اعظم ہے اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ علیحدہ سے اس شخص کے دعاوی کو دیکھا جائے تاکہ معلوم ہو کہ وہ مدعی کسی منصب کا ہے یا نہیں؟

پھر اس مظاہرہ سے اس استدلال کی بنیاد سمجھ میں نہیں آتی کہ خارق عادت امر کے ظاہر کرنے سے اس کے مظہر اور دعویدار نبوت کی سچائی کیوں کر ثابت ہوتی ہے؟ اس کے لئے پھر عقل کو درمیان میں لانے کی ضرورت ہے کہ وہ دلیل کو ترتیب دے اور بتلائے کہ خارقِ عادت کا ظاہر کرنا کس طرح دعویدار منصب کی سچائی کا ثبوت ہوتا ہے؟

پھر وہ خرق عادت کا مظاہرہ یہ بھی نہیں بتاتا کہ میرا ظاہر کرنے والا اپنی سیرت و کردار کے لحاظ سے کیسا آدمی ہے اور یہ بھی ثبوت اعجاز کا بڑا رکن ہے کیوں کہ اگر مدعی نبوت ایک ایسا شخص ہے جس کا سابقہ زندگی اور افعال واعمال کی گندگی یہ خود اس کے دعوے کے رد کرنے کے لئے کافی ہے تو اس صورت میں وہ لاکھ غیر معمولی کرتب دکھلائے کسی طرح خدا پر

ذمہ داری عائد نہ ہوگی اور اسے ان عجیب وغریب مظاہرات کو باطل کرنے کی ضرورت نہ ہوگی لہٰذا خوارق عادات کے ساتھ یہ الگ سے اس مدعی منصب کی سیرت سابق وحال زندگی میں دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس کے افعال کیسے ہیں اور وہ اس کو خدا کی طرف سے کسی منصب کے لائق ثابت بھی کرتے ہیں؟ یقیناً وہ تمام معجزات ان تمام اعتبارات سے بالکل گنگ اور خارجی تحقیقات اور عقلی غور وفکر کے دست نگر اور ممنون احسان ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قرآن مجید کی خصوصیت ہے کہ وہ معجزہ اور اعجاز کے جتنے ارکان وخصوصیات ہیں وہ سب اسی میں موجود ہیں اور کہیں اس سے علیحدہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

پہلا امر:

قرآن مجید میں صاف صاف اپنے حامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دعویٰ نبوت ورسالت کا اظہار موجود ہے۔ ملاحظہ ہوں آیات ذیل:

قُلْ يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً.

(اعراف۔۱۵۸)

کہیے کہ اے گروہ مردم میں خدا کا رسول ہوں تم سب کی طرف

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ﴿٢﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿٣﴾ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى. (نجم ۲ تا ۴)

تمہاری ہدایت کرنے والا شخص نہ تو گمراہ اور نہ شرگشتہ وہ اپنی خواہش دل سے کلام ہی نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر اتاری جاتی ہے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ

(سورۂ فتح۔۲۹).

محمد ﷺ خدا کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں کے مقابلہ میں بڑے سخت ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۝ (سورۂ احزاب۔۴۰)

محمد ﷺ نہیں ہیں تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ لیکن خدا کے رسول اور فہرست انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں۔

دوسرا امر:

اس نے اپنے غیر معمولی درجہ اعجاز کو آپ کی نبوت ورسالت کی دلیل بتلایا اور کہا کہ اگر تم کو ان کی سچائی اور حقانیت میں شک ہو تو اس کے مثل پیش کرو اور اگر ایسا نہ کر سکو فَاعْلَمُوْٓا أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ تو سمجھ لو کہ وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ (ہود۔۱۴) اس طرح اعجاز کے وجہ استدلال عقلی کو اہل عقل کے متنبہ کرنے کے لئے ذکر کیا۔

تیسرا امر:

اس نے جناب رسالت مآبؐ کے اخلاق کی پاکیزگی اور کمال طہارت کو متعدد آیات میں ظاہر کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آپؐ کی زندگی اخلاق حسنہ سچائی اور پاکیزگی کا نمونہ رہی ہے جس کی بناء پر آپؐ کی سیرت آپؐ کے بلند دعوے کیے شایان شان ہے ارشاد ہوا:

وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿٤﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿٩﴾

(سورۂ قلم۔۴ اور ۹)

یقیناً آپ بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہیں۔ان لوگوں کی یہ آرزو ہے کہ آپ سے کسی دورنگی کا ظہور ہوتو یہ بھی دورنگی سے کام لیں۔

نیز آپ کے تعلیمات کی پاکیزگی کے متعلق ارشاد کیا:

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ.(سورۃ اعراف۔۱۵۷)

وہ انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

اورخود اپنے مندرجہ تعلیمات پر اہل نظر کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع دیتے ہوئے ارشاد کیا۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ . (سورۃ بنی اسرائیل۔۹)

یقین جانو کہ یہ قرآن دعوت دیتا ہے ایسی باتوں کی طرف جو بالکل سیدھی سیدھی اور صحیح ہیں۔

اس طرح قرآن مجید نے تمام وہ پہلو جو ایک معجزہ کی صحت کے سلسلہ میں غور کے قابل ہوا کرتے ہیں سب خود ہی پیش کردیئے اور اہل نظر کی نظر کے سامنے رکھ دیئے جس کے بعد غور کرنا نہ کرنا خود ان اشخاص کے حسن اختیار اور سوءِ اختیار کا نتیجہ ہوگا اور حجت پوری قوت کے ساتھ تمام ہوگئ۔

(۲)

اعجاز قرآن کے مختلف رخ

تاریخی حیثیت

حضرت رسول ﷺ کو کوئی ویسا فرض کرلے جیسا ان کے دشمن کہتے ہیں کہ انہوں نے توریت اور انجیل کے مندرجہ واقعات افواہی حیثیت سے عام اشخاص سے سنے اور انہیں قرآن میں درج کردیا۔

اس کا نتیجہ کیا ہونا چاہئے؟ یہ کہ توریت وانجیل میں جس طرح واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اس کے ساتھ قرآن مندرجہ واقعات ایسے اضافے اختلافات اور حواشی ہوتے جن میں واقعت کے متانت اور استحکام کا پتہ نہ ہوتا اور افواہی باتوں کی خرافت آمیز داستانوں کا اثر بہت نمایاں ہوتا یعنی توریت وانجیل کے مندرجہ واقعات میں اگر خلاف عقل وفطرت اور منافی اصول دینیہ باتیں نہ تھیں تو اس میں نظر آتیں اور اگر تھیں تو اس میں بہت بڑھ جاتیں۔

لیکن جب ہم توریت وانجیل کے مندرجہ واقعات اور پھر قرآن مجید میں انہی واقعات کے تذکرہ کو دیکھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ بائبل کے واقعات میں اس درجہ دور از کار اور خرافت آمیز روایات کی بھرمار ہے کہ کسی طرح عقل و مذہب کے رو سے انہیں صحت کی سند کا دیا جانا ممکن نہیں ہے اور قرآن انہی واقعات کو تمام ان خرافتوں اور دور از کار باتوں کو حذف کر کے ایسے صحیح اور موافق فطرت انداز سے پیش کرتا ہے جسے عقل اصلیت کی سند دینے پر مجبور ہے۔

ملاحظہ ہوتوریت کتاب پیدائش فصل ۳ میں حضرت آدمؑ کے ممنوعہ درخت سے
تناول فرمانے کا قصہ اور اس میں جو کچھ دُوراز کار باتیں ہیں جن سے خدا کی طرف غلط
بیانی اور فریب کاری کا الزام عائد ہوتا ہے۔

اور فصل ۱۵ میں ابراہیمؑ کا واقعہ کہ ان کو خدا کے وعدہ میں شک ہوا شام میں
زمین عطا کئے جانے کے متعلق اور فصل ۱۸۔۱۹ میں ملائکہ کے آنے کا تذکرہ ابراہیمؑ کے
پاس ولادت اسحاقؑ کو خوشخبری لے کر اور کتاب خروج فصل ۳ میں خداوند عالم کا خطاب
موسیٰؑ سے درخت کے ذریعہ سے اور اس کا وہ ضمیمہ جس سے پتہ چلتا ہے کہ خدا کی تعلیم موسیٰؑ
کو شروع ہوتی تھی غلط بیانی کے سبق کے ساتھ اور فصل ۳۲ میں ہارون کا قصہ کہ انہوں نے
گوسالہ تیار کرایا تھا جو خدائے بنی اسرائیل کی حیثیت سے قرار دیا جائے اور انہوں نے
اس کے لئے قربانی اور عبادت کے طریقے مقرر کئے تھے۔

ان تمام واقعات کا ایک دفعہ توریت میں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کیا
کیا باتیں ایسی ہیں جو کسی طرح عقل و دین کی روشنی میں صحیح تسلیم کیے جانے کے قابل نہیں
ہیں جن سے جلالِ الٰہی اور طہارت انبیاء پر دھبہ آتا اور بہت سے اصول عقلیہ کو دھچکا
پہونچتا ہے اور پھر انہی واقعات کو قرآن مجید میں نکال کر ملاحظہ کیجئے معلوم ہوگا کہ قرآن
مجید میں تمام وہ زوائد حذف ہیں جو مذکورہ بالا حیثیت سے ناقابل قبول تھے اور اس میں
تمام واقعات ایسے انداز سے بیان ہوئے ہیں جو کسی طرح شان حضرت الٰہی اور شان
انبیاء و مرسلین کے خلاف نہیں ہیں۔

ملحقات توریت میں جو واقعات مذکور ہیں وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہیں ہیں
حضرت ایوبؑ کی طرف انتہائی جزع فزع اور خدا سے شکوہ بلکہ اس پر اعتراض کی نسبت
حضرت داؤدؑ کی طرف زنا کاری کی شرمناک نسبت حضرت سلیمانؑ کی طرف کفر و شرک
کے رواج دینے کی نسبت وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات جو ایک لحظہ کے لئے صحیح تسلیم نہیں

کئے جاسکتے۔

بلکہ توریت اور اس کے ملحقات میں مذکورہ بالا امور سے بڑھ کر بعض باتیں ملتی
ہیں جیسے حضرت لوطؑ کی طرف شراب خوری اور نشہ شراب میں اپنی دونوں لڑکیوں کے ساتھ
زنا کاری، حضرت یعقوبؑ کی خدا کے ساتھ کشتی حضرت یعقوبؑ کے اپنے والد کے ساتھ
فریب کاری، خدا کا مشورہ آسمانی فرشتوں کے ساتھ کہ آخاب بادشاہ بنی اسرائیل کو گمراہ
کیا جائے اور اس کے علاوہ بہت باتیں جن سے پرانے عہد نامہ کے صفحات پورے طور پر
مملو نظر آتے ہیں۔

انجیل مقدس جو حضرت مسیحؑ کی تاریخ زندگی ہے اس میں بھی اختصار و کمی صفحات
کے باوجود حضرت مسیحؑ کی طرف ایسے واقعات کی نسبت موجود ہے جو کسی طرح اُن کی
شان کے لائق نہیں ہے جیسے شیراب خوری غلط بیانی ماں اور بھائیوں کے ساتھ بداخلاقی
اور نامحرموں کے ساتھ اخلاق سوز بے باکی۔

بلاشبہ قرآن مجید کے زمانہ میں اور اس کے قبل انبیاء و مرسلین کے تاریخی
معلومات کے لئے یہود، قسیسین، نصاریٰ کی تعلیمات کے سوا کوئی سرچشمہ نہ تھا اور توریت
وانجیل ہی کے مندرجات تھے جو اخبار یہود و قسیسین نصاریٰ کے نوکِ زبان تھے۔

تو رسول اسلامؐ نے اگر ان تعلیمات کو یہود و نصاریٰ کے علماء سے حاصل کیا
ہوتا تو وہ تمام خرافات جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے اس حدتک تو آپؐ کے یہاں بھی
ملتے جو عام عیسائی علماء کے یہاں از قبیل مسلمات تھے اور اگر آپ ان کو صرف افواہی
حیثیت سے صرف عوام کی زبانی سن کر نقل کرتے جیسا کہ عام عیسائی مولفین ظاہر کرنا ضرور
ی سمجھتے ہیں تو عام نظام عادات کے مطابق اس میں توریت اروانجیل کے اصل مندرجات
سے بدرجہ زیادہ خرافات اور دوراز کار باتیں آجاتیں لیکن اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں
کہ قرآن نے واقعات کے جو بائبل میں واقعیت کی شان کے بالکل خلاف تھے بالکل ذکر

ہی نہیں کیا اور جن واقعات کا بائبل کے ذکر کیا ان کو تمام اضافوں سے الگ کر کے جو اس واقعہ کو واقعیت کے حدود سے الگ پھینکنے کے ذمہ دار تھے۔

اس سے ایک غیر جانبدار انسان کی عقل کو صاف اس نتیجہ تک پہنچنا چاہئے کہ در حقیقت واقعات کی مسخ شدہ صورت وہ تھی جو توریت وانجیل میں رائج ہوگئی تھی اور خدائے قدوس نے جس کا کام بندگان خدا کی ہدایت ہے اپنے اس رسول کو جو خاتم المرسلین ہے ان تمام صحیح واقعات کی اصل صورت میں تعلیم دی تاکہ توریت وانجیل میں پڑی ہوئی خرابیوں کی اصلاح ہوجائے اور گمراہ کن خیالات کا جو جلال الٰہی اور شان انبیاء کے منافی واقعات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں قلع قمع اور آئندہ کے لئے سد باب ہوجائے۔

استدلالی حیثیت سے

قرآن کے محل نزول پر غور کیجئے عرب کی جہالت کفر وشرک کا دور دورہ گمراہی کی شدت عقلوں کی تاہ نگاہوں کی ظاہر بینی علوم وفنون سے اجنبیت اور منطق وفلسفہ سے بالکل ناشناسی اس سب کو دیکھے اور پھر قرآن مجید کے معارف وحقائق سے بھرے ہوئے آیات کی تلاوت کیجئے خاص مسائل توحید اور عدل ونبوت کے مضبوط استدلات کا مطالعہ کیجئے ان آیت کے عمق کو دیکھئے باریک بین دقیق فلسفی نگاہوں سے ان کے معانی پر غور کیجئے معلوم ہوگا کہ وہ کس پایہ کا کلام ہے اور ذہن فیصلہ کرے گا عقل وعادت فطرت و طبیعت کی رو سے اس طرف میں پیدا ہونے والے کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا۔اس کے ساتھ بائبل کے ان استدلالوں پر نظر ڈالئے جو حضرت مسیحؑ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں تو محسوس ہوگا کہ ان طریقوں سے اثبات مطلب کی ناکام کوشش کسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے شایان شان نہیں ہے۔۔۔یہاں تک کہ بعض مقامات پر تعداد الٰہ اور شرک تک کا نتیجہ برآمد ہوتا ہے ایسی کمزوریوں سے قرآن منزہ ومبرا ہے۔

تشریعی حیثیت سے

اس کا عام ذہن پورا اندازہ تو نہیں کر سکتے مگر بہت سے صحیح ذوق اور پختہ عقل رکھنے والے افراد جنہوں نے دنیا کے قوانین واصول انتظامی کا انتقادی نظر سے مطالعہ کیا ہے موازنہ کر کے دو قسم کی تعلیموں میں اتنا ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کون روح انتظامی کے ساتھ زیادہ موافق اور مفاد اجتماعی کے مطابق اور کہاں تک عملی ہے اور فطرت کے ساتھ سازگار اس کے علاوہ اس کا سمجھ لینا تو ہر شخص کے لئے آسان ہے کہ کس قانون میں جامعیت پائی جاتی ہے اور شخصی ونوعی ،انفرادی واجتماعی ہر قسم کے احکام پر حاوی ہے۔

بلاشبہہ قرآن مجید کے نزول کے زمانہ میں ایک شریعت موجود تھی شریعت موسویہ جو یہود ونصاری دونوں کے نزدیک مسلم تھی اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف نسبت رکھنے والا ایک آئین تھا جو اگرچہ اس اعلان کی بناء پر کہ زمین وآسمان ٹل جائیں مگر موسیٰؑ کی شریعت کا ایک شوشہ نہیں ٹل سکتا شریعت موسوی کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں ہونا چاہئے لیکن وہ عمل طور پر شریعت موسویہ کے خلاف ایک مستقل چیز بن گیا تھا۔

اس کے علاوہ ایران میں زردشتی مذہب سے تعلیمات تھے اور زردشت کی ایک مستقل شریعت تھی جو زندہ حیثیت رکھتی تھی اور ہزاروں آدمیوں کو اپنا پابند بنائے ہوئے تھی۔

کوئی بھی دین اگر اساسی حیثیت سے صحیح ہے تو اس کی شریعت کے اجزاء اصلی یقیناً وہی ہوسکتے ہیں جو خدائے قدوس کے نازل کردہ ہیں یہ اور بات ہے کہ بعد کی تراش خراش نے ان میں تبدیلی کر دی ہو اور طرح طرح سے مسخ کر دیا ہو۔شریعت موسوی اور عیسوی اس کی یقینی مثال ہے۔

زردشت کے متعلق چوں کہ قرآن نے نبوت کی گواہی نہیں دی ہے لہٰذا اسے قطعی حیثیت حاصل نہیں ہے لیکن قرائن اور بعض اخبار و آثار کی بناء پر بہت سے لوگ نبوت کے قائل ہیں جس کی نفی کے لئے بھی قطعی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس صورت میں اگر ان شریعتوں میں کچھ ایسے احکام موجود ہوں جو قرآنی احکام کے ساتھ متحد ہیں تو اس میں کوئی اعتراض ان کی بات نہیں ہے لیکن دیکھنے کا امر یہ ہے کہ قرآن میں ان مشترک احکام سے بہت زیادہ اور زندگی کے بہت سے ایسے شعبوں کے متعلق کتنے ایسے احکام وقوانین ہیں جن کا مذکورہ بالا شریعتوں میں صراحۃً وجود کیسا اشارہ بھی نہ تھا۔ اس سے بے لوث ضمیر کو اس نتیجہ تک پہونچنا چاہئے کہ اس شریعت کو طویل عمر زمانہ کے ضروریات کے مطابق اسی خدا نے نازل کیا ہے جس نے ان شریعتوں کو ان کے محدود زمانہ کے لحاظ سے محدود احکام پر مشتمل نازل کیا تھا اور اسی لئے آخرِ عمرِ دنیا تک اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اخلاقی حیثیت سے

بلا شبہ علم اور تربیت کا انسان کے اخلاق پر بڑا اثر پڑتا ہے جہالت اور علوم صحیحہ سے ناواقفیت بڑی سے بڑی بداخلاقیوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اور اخلاق کی جان جو کچھ بھی ہے وہ ملکات نفسیہ اور قوائے طبعیہ میں اعتدال کے نقطہ کی پابندی اور افراط وتفریط سے کنارہ کشی ہے۔

بڑے بڑے معلم کے تعلیمات اس وقت بے قیمت ہیں جب وہ یا تو تفریط کی وجہ سے اس حد تک کمزور ہوں کہ ان سے امن وانتظام اور تحفظ وتہذیب وشائشتگی کا مقصد حاصل ہی نہ ہوتا ہو اور یا افراط کے لحاظ سے اس درجہ زیادہ ہوں کہ وہ نفسانی طرف کے تقاضوں کی بناء پر کبھی ممنون عمل بن ہی نہ سکیں۔

توریت اور انجیل مرّوجہ کے اخلاقی تعلیمات کی نوعیت انہی دونوں راستوں میں تقسیم ہے اول الذکر افراط اور ثانی الذکر تفریط کے لحاظ سے اعتدال سے علیحدہ ہیں۔

لیکن قرآن مجید کی تعلیم ہر شعبہ حیات میں حد وسط کا درجہ رکھتی ہے وہ افراط و تفریط دونوں سے مبرا ہے۔ اور اس لئے ہر شخص کے لئے ممکن العمل اور تہذیب وشائشتگی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔

یہ خصوصیت بھی قرآن مجید کی وہ ہے جو اس کو تمام کتب ادیان میں ممتاز درجہ عطا کرتی ہے اور اس کے ساتھ جب عرب کی جہالت اور رسول عربیؐ کے ماحول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے گا تو ماننا پڑے گا کہ وہ الہامی وآسمانی حیثیت رکھتی ہے اور یقیناً خداوند عالم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

(۳)

نفیِ تحریف

فرقہ امامیہ کا قول کہ قرآن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی

واضح ہو کر طبقہ محدثین کے استاد کل جن کی دقت نظر احادیث کے نقل کرنے میں شہرہ آفاق ہے یعنی جناب صدوقؒ کتاب الاعتقادات میں تحریر فرماتے ہیں:

ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن جسے خداوند عالم نے اپنے نبیؐ پر نازل فرمایا وہ یہی ہے جو دونوں دفیتوں کے درمیان موجود ہے اور وہ اس سے زیادہ نہیں ہے اور جو شخص ہماری طرف نسبت دے کہ ہم اصل قرآن کو اس سے زیادہ مانتے ہیں وہ بالکل جھوٹا ہے موصوف نے ان تمام روایات کو جو کمی کے بارے میں وارد ہوئی ہیں دوسرے معانی پر محمول کیا ہے۔

''فصل الخطاب'' کے اواخر میں شیخ مفیدؒ کی کتاب مقالات سے یہ عبارت درج کی ہے کہ ''فرقہ امامیہ'' میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں ایک کلمہ، ایک آیت اور حروف کی بھی کمی نہیں ہے بے شک جناب امیرؑ کے جمع کردہ قرآن میں جو تاویل اور تفسیر اس کے معانی کی اس کے اصل شان نزول کے موافق ہوئی تھی وہ کم کر دی گئی ہے اور جناب سید مرتضیٰ علم الہدیٰؒ کا بھی قول ہے کہ قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور معدودے چند افراد جو فرقہ امامیہ اور حشویہ میں کے اس کے خلاف قائل ہو گئے ہیں وہ توجہ کے بھی مستحق نہیں ہیں اس کے خلاف قول ہے وہ اخباریوں میں سے افراد کی طرف منسوب ہے جنہوں نے کچھ ضعیف روایتوں کو صحیح سمجھ کر یہ قول اختیار کر لیا ہے۔

شیخ طوسیؒ کی کتاب تفسیر ''تبیان'' کے شروع میں ہے کہ قرآن مجید کے متعلق زیادتی

یا کمی کا سوال اٹھایا جانا بھی مناسب نہیں ہے اس لئے کہ زیادتی کے نہ ہونے پر تو اجماع ہے اور کمی اس کے متعلق بھی تمام مسلمانوں کے مذہب کا ظاہر یہ ہے کہ واقع نہیں ہوئی اور خصوصیت سے ہمارے مذہب میں بھی صحیح قول یہی ہے اور اسی کی حمایت جناب سید مرتضیٰؒ نے کی ہے اور احادیث سے بھی وہی ظاہر ہے بے شک شیعہ اور سنی کی طرف سے بہت سی روایتیں ایسی وارد ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سی آیتیں قرآن کی کم ہو گئیں اور بعض اپنی جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ پہنچ گئیں لیکن یہ روایتیں بطریق احاد منقول ہیں جن پر نہ علم کی بنیاد ہو سکتی ہے نہ عمل کی اور بہتر یہ ہے کہ ان روایات سے کنارہ کشی ہی اختیار کی جائے۔''

تفسیر مجمع البیان میں بھی بالکل اس سے اتفاق کیا ہے اور کشف الغطاء کتاب قرآن میں ہے کہ ''اٹھواں مبحث نقص قرآن کے بارے میں یقیناً قرآن مجید نقص کے عیب سے محفوظ ہے خدا کی غیبی حفاظت کے ساتھ جس پر صریحی قرآن کی آیت دلالت کر رہی ہے اور ہر زمانہ کے علماء کا اجماع بھی اسی کے موافق ہے اور شاذ و نادر بعض لوگوں کا قول قابل توجہ نہیں ہے اور جو جو روایت ایسے ہیں کہ ان نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے ضرورت مذہب ان کے ظاہر پر عمل سے مانع ہے لہٰذا کسی نہ کسی طرح ان کی تاویل کرنا چاہئے۔

شیخ بہائیؒ کا قول ہے کہ زیادتی اور نقصان کے متعلق اختلاف ہے اور صحیح یہی ہے کہ قرآن ہر طرح کی زیادتی و کمی سے محفوظ ہے اور قول خداوند عالم کہ ''ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اس کی دلیل ہے'' اور یہ جو مشہور ہے کہ بعض جگہ امیر المومنینؑ کا نام تھا وہ حذف ہو گیا جیسے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فِيْ عَلِيٍّ۔ وغیرہ یہ بالکل غیر معتبر ہے:

اور سید محسن بغدادی نے ''شرح وافیہ'' میں لکھا ہے کہ ہمارے علماء میں جو قول مشہور ہے اور جس پر اجماع کا دعویٰ ہوا ہے وہ یہی ہے کہ کمی واقع نہیں ہوئی۔

اور محقق ثانی علی بند عبدالعالی کرکی نے ایک مستقل رسالہ قرآن مجید میں کمی نہ

ہونے کے متعلق تحریر فرمایا ہے۔ پھر انہوں نے صدوقؒ کا کلام ذکر کیا ہے اور بطور اعتراض
ان احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے جن سے نقص قرآن کا پتہ چلتا ہے جواب دیا ہے کہ
حدیث جب قرآن اور احادیث متواترہ یا اجماع کے خلاف ہو اور اس کی تاویل ممکن نہ
ہو تو اسے ساقط کرنا چاہئے۔

ان تمام علماء کے برخلاف ہمارے ہم عصر محدث (فاضل نوری) نے فصل
الخطاب میں کوشش کے ساتھ ان روایات کو جمع کیا جن سے وہ قرآن میں کمی واقع ہونے
پر استدلال کرتے ہیں اور ان روایت کے اسناد میں کثرت پیدا کی ہے ان روایتوں سے
کہ جو مرسل طریقہ (یعنی بغیر ذکر سند کے) تفسیر عیاشی وفرات بن ابراہیم وغیرہ میں مذکور
ہیں۔ حالاں کہ جو شخص جستجو کرے اور ذوق تحقیق رکھتا ہو وہ یقین کرے گا کہ یہ مرسل
روایتیں انہی چند مسند روایتوں سے ماخوذ ہیں جو کسی طرح صحیح ہو ہی نہیں سکتیں اور بعض
آپس میں اتنا اختلاف رکھتی ہیں کہ خود ہی متعارض ہو جاتی ہیں اس مختصر کتاب میں اتنی
گنجائش نہیں ہے کہ ان آخری دونوں قسموں کو توضیح کے ساتھ لکھا جائے اس کے علاوہ اکثر
مستند روایتیں جو ہیں ان کی سندیں چند اشخاص تک منتہی ہوتی ہیں جن میں سے کسی کے
متعلق علمائے رجال لکھتے ہیں کہ وہ لا مذہب شخص ہے اس کی حدیثیں کمزور اور روایتیں
متروک ہیں کسی کے متعلق یہ کہ اس کے احادیث اور مذہب دونوں مشکوک ہیں اس کی
حدیث کبھی قابل قبول ہوتی ہے اور کبھی نا قابل قبول، اور وہ کمزور راویوں سے احادیث کو
نقل کرتا ہے اور کسی کی نسبت یہ لکھا ہے کہ وہ بہت زیادہ غلط بیان اور نا قابل اعتبار ہے
میں جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی تفسیر سے ایک روایت بھی نقل کروں اور یہ کہ وہ واقفی ہونے
میں مشہور ہے اور امام رضاؑ سے سخت عداوت رکھتا تھا اور کبھی یہ کہ اس کی روایتیں بالکل
خراب ہوتی ہیں اس کی غلو کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے راویوں کی تعداد کی کثرت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی اور گر ہم

چشم پوشی کر کے اتنے بڑے اہم موضوع پر ان لوگوں کی روایات کو قبول بھی کر لیں تو
دوسری متعدد روایتوں کی بناء پر ہمیں ان روایات کے معنی میں یہ کہنا چاہئے کہ جو فقرات
ان میں حذف شدہ بتلائے گئے ہیں وہ تفسیر کی حیثیت رکھتے تھے یا تاویل تھے یا بیان
تھے اس فرد کا جو یقیناً اس عموم کے تحت میں داخل ہے اپنے اظہر افراد اور مستحق ترین
شخصیت ہونے کی جہت سے حکم عام کے ساتھ یا اس فرد کا جو عموم کے ضمن میں تنزیل
قرآن کے وقت خصوصیت سے ملحوظ تھی۔ یا اصل جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی
تھی یا جو مبہم الفاظ (مائے موصولہ وغیرہ) سے مراد اصلی تھی۔ انہی آخری تین پہلوؤں پر
محمول ہونا چاہئے ان روایت کو جن میں لکھا ہے کہ یہ تنزیل ہے اور اس کو جبرائیل لے کر
آئے تھے اور اس معنی کی دلیل خود ان روایت میں جمع کا عمل میں لانا ہے اور تحریف سے
مراد تحریف معنوی ہے جس کے شاہد امام محمد باقرؑ کی وہ تحریر ہے جو آپ نے سعد خیر کو لکھی
ہے اور جو کافی کی کتاب روضہ میں مذکور ہے اور اس میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کی طرف
سے کتاب خدا کا پس پشت ڈال دینا یہ تھا کہ انہوں نے اس کے مکتوبی الفاظ کو تو قائم رکھا
اور اس کی جو مقررہ حدیں تھیں ان میں تحریف یعنی تبدیلی کر دی اسی طرح وہ روایات جن
میں یہ ہے کہ مصحف جناب امیرؑ یا مصحف ابن مسعود میں اس طرح لکھا ہے اس سے مراد
یہی ہے کہ بطور تفسیر و تاویل تحریر تھا اس کی شہادت دینے کے لئے موجود ہے جناب امیرؑ
کا قول جو آپ نے زندیق سے فرمایا ''میں ان کے پاس لایا پوری کتاب جو تنزیل اور
تاویل دونوں پر مشتمل تھی''۔

ان روایات میں سے جن کی نسبت ہم نے اشارۃً تحریر کیا یہ ہے کہ فاضل
معاصر (محدث نوری) نے چار روایتیں درج کی ہیں جن میں یہ ہے ''بولایۃ علی'' کا
فقرہ مصحف حضرت فاطمہؑ میں تحریر تھا کسی میں ہے کہ وہ مصحف فاطمہؑ میں یونہی تھا اور واضح
ہونا چاہئے کہ جناب فاطمہؑ کی مصحف قرآن نہیں تھا بلکہ وہ ایک کتاب تھی جس میں علمی رموز و

اسرار کا تذکرہ تھا جیسا کہ اصول کافی کی متعدد روایتوں سے جو صحیفہ اور مصحف اور جامعہ کے باب میں درج ہیں ثابت ہوتا ہے ان میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول ہے کہ اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں ہے کہیں یہ ہے کہ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اس میں قرآن ہے جیسا کہ صحیح و حسن حدیثوں میں وارد ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کافی میں اس باب میں کہ ائمہ معصومینؑ لوگوں پر گواہ ہیں صحیح حدیث برید کی امام محمد باقر سے اور دوسری حدیث امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ ان دونوں حضرات نے آیت کے بارے میں کہ جَعَلْنَا كُمْ اُمَّةً وَّ سَطاً فرمایا امت وسطیٰ ہم ہیں۔ امیر المومنینؑ سے اس کی تفسیر میں وارد ہوا ہے کہ ہم وہ ہیں جن کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ''ہم نے تم کو امت وسطیٰ قرار دیا''۔ اب جو مرسل طور پر تفسیر نعمانی و تفسیر سعد میں وارد ہے کہ آیت میں ائمہ وسطیٰ ہے۔

اس کو تفسیر ہی پر محمول کرنا چاہئے اور یہ کہ معنی امّۃ وسطیٰ کے ائمہ وسطا تھے جس کو لوگوں نے بدل دیا نیز کافی میں اس باب میں ائمہ معصومینؑ ہادی اور رہنما ہیں۔ فضل کی روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے معنی دریافت کیے کہ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ہر قوم کے لئے ایک ہادی ہے حضرت نے فرمایا کہ ہر امام رہنما ہے اس طبقہ کا جس میں وہ ہے اور برید کی روایت ہے امام محمد باقر سے اسی آیت کی تفسیر میں کہ رسالت مآب مُنْذِر (عذاب الٰہی سے خوف دلانے والے) ہیں اور ہر زمانہ میں ہم میں سے ایک رہنما ہے جو رسالت مآبؐ کے احکام کی طرف ہدایت کرتا ہے اور رسالت مآبؐ کے بعد جو رہنما ہوئے ہیں وہ جناب امیرؑ ہیں اور ان کے بعد کے اوصیاء یکے بعد دیگرے اسی کے مثل ہیں۔

روایت ابوبصیر کی امام جعفر صادقؑ سے اور روایت عبدالرحیم قصیر کی امام محمد باقر علیہ السلام سے ان سب میں یہی ہے کہ رسالت مآبؐ منذر ہیں اور علی ابن ابی طالبؑ ہادی

اور اس مضمون کی روایتیں اہل سنت کے یہاں بھی ہیں ابوہریرہ اور ابوبرزہ اور ابن عباس اور نیز خود امیر المومنینؑ کے اسناد سے اور حاکم نے مستدرک میں اس روایات کو صحیح السند قرار دیا ہے۔

ان تمام روایات کے ہوتے ہوئے بھی کیا کوئی شخص پسندیدگی کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ فصل الخطاب کی اس کاوش کو جو انہوں نے بعض متاخرین کی تفسیروں سے اور میر باقر دامادؒ کے حاشیہ اقتباسات سے بعض روایتوں کے درج کرنے میں اختیار کی ہے اور لکھا ہے کہ روایات شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے کثرت کے ساتھ ہیں کہ اصل آیت یوں تھی کہ۔ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ الْعِبَادِ وَعَلِیٌّ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (بس تم میرے بندوں کے ڈرانے والے ہو اور علیؑ ہر قوم کے لئے رہنما ہیں)۔ یہ ایک شعر جس کو قصیدہ خوان پڑھ سکتے ہیں باقی کوئی شخص جو عربی زبان میں ایک درجہ رکھتا ہو وہ اسے گوارا نہ کرے گا کہ اس کی طرف اس شعر کے نظم کرنے کی نسبت دی جائے اور طرق شیعہ و اہلسنت کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو بے شک و شبہہ ان طرق میں سوا اس کے جو ہم نے سابقاً درج کیا اور کچھ نہیں اور وہ اس سے جو محدث نوری نقل کر رہے ہیں مختلف ہے۔

''قیاس کن زگلستان من بہار مرا''

نیز کافی کی روایت ہے جو ابوحمزہ سے امام محمد باقرؑ نے فرمایا کہ: کفار کا قول: رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ اس سے مراد ولایت علی بن ابی طالبؑ کا انکار تھا۔ یہ الفاظ صراحۃً بتلا رہے ہیں کہ یہ تفسیر کی حیثیت سے ہے اس صراحت کے سبب سے توضیح ہو جائے گی۔ ابوبصیر کی ان دونوں ضعیف روایتوں کی جن سے بظاہر یہ پتہ چلتا ہے کہ بولایۃ علی کی لفظ قرآن میں داخل تھی اور وہ حذف کر دی گئی ہے۔

عمر بن حنظلہ کی روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے سورہ بقرہ کی اس آیت میں کہ متاعًا اِلَی الحول غیر اخراج آپ نے فرمایا مخرجات عبارت کو دیکھتے ہوئے شبہہ

بھی نہیں ہوسکتا سوا اس کے کہ یہ مخرجات کا فقرہ بطور تفسیر بیان ہوا ہے یعنی اخراج کی لفظ سے مخرجات مراد ہے نہ یہ لفظ یہاں پر تھی اور وہ قرآن مجید سے کم کردی گئی ہے لیکن کتاب فصل الخطاب میں اس کو بطور بیان نقصان درج کیا ہے۔

نیز ان روایات میں سے محمد بن مسلم کی صحیح السند و روایت ہے امام جعفر صادقؑ سے جو کتاب کافی میں باب ''منع الزّکوٰۃ'' کے شروع میں درج ہے اس میں ہے کہ حضرتؑ نے فرمایا یہی مراد ہے اس ارشاد حضرت احدیت سے کہ ان لوگوں کو طوق پہنائے جائیں گے اس شے کے جس کے ساتھ انہوں نے بخل کیا ہے یعنی جو انہوں نے بخل کیا ہے مال زکوۃ میں سے یہ روایت بالکل صراحت کے ساتھ اس امر کو بتلاتی ہے کہ من الزکوۃ کی لفظ بطور تفسیر ہے جو امامؑ نے بیان فرمائی ہے۔ نہ یہ کہ وہ جزء قرآن ہے اور اس روایت کی یہ صراحت شرح قرار پائے گی ابن عمیر والی مرسل نے روایت کی جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ قول باری تعالیٰ ہے۔ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ مِنَ الزَّكٰوةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۝

اور اس روایت کے معنی بھی وہی ہوں گے کہ **ما بخلوا بہ سے مراد من الزکوۃ** ہے نہ یہ کہ وہ قرآن کا جزء ہے اور کم کردیا گیا ہے نیز انہی روایات میں سے صحیحہ ابو بصیر ہے امام جعفر صادقؑ سے جیسا کہ کافی میں باب ''نَصّ عَلَى الْأَئِمَّه'' میں مذکور ہے اس روایت میں ہے کہ ابو بصیر نے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ خداوند عالم نے حضرت علیؑ اور آپ کی اولاد کا نام قرآن میں ذکر کیوں نہ کردیا حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو کہ رسالت مآبؐ پر قرآن میں یہ نازل ہوا کہ نماز واجب ہے لیکن خدا نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ مغرب کی تین رکعت ہے اور عشاء کی چار رکعت یہاں تک کہ رسالت مآبؐ وہ تھے جنہوں نے لوگوں کے سامنے اس کی تفسیر عمل کر کے ظاہر فرمائی اور اسی طرح قرآن نے اجمال سے زکوۃ و حج کے بارے میں کام لیا اور رسولؐ خدا نے تفصیل بتلائی۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ امامؑ نے لوگوں کے اس قول کی رد نہیں فرمائی کہ قرآن مجید میں امیر المومنینؑ کا نام صراحۃً مذکور نہیں بلکہ اس کے دوسرے نظائر پیش کر کے ان کے استدلال کی رد فرمائی۔

اس کی گواہ وہ روایت بھی ہے جو کافی میں اس کے تھوڑی دور بعد صحیحہ فضلاء میں وارد ہے امام محمد باقرؑ سے اور ابو الجارود کی روایت حضرتؑ سے اور ابو الدیلم کی روایت حضرت امام جعفر صادقؑ سے کہ ان دونوں بزرگوں نے مقام استدلال میں اپنے اصحاب کے سامنے جب کہ تقیہ کا موقع بھی نہ تھا يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔ (مائدہ۔۶۷) کی تلاوت فرمائی اور اس میں ''فی علیّ'' نہیں کہا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو اس مقام پر یا دوسرے مقامات پر ''فی علیّ'' کی لفظ ہے وہ بطور تفسیر و بیان ہے جیسے جبرائیل بطور وحی خدا کی طرف سے لائے ہیں لیکن جزء قرآن نہیں ہے اور اس طرح کی وحی تو ہر کلام رسالت مآبؐ کے موافق ہوتی تھی اس لئے کہ (قرآن میں موجود ہے) آپ اپنی خواہش نفس سے بات ہی نہیں کرتے جو کچھ آپ کا کلام ہوتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔

نیز ان روایات میں سے فضیل کی روایت ہے۔ امام رضاؑ سے کافی کے باب ا ''معنی التنزیل فی الولایة'' میں کہ راوی نے عرض کی یہ آیت هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تُكَذِّبُونَ ۝ حضرت نے فرمایا یعنی امیر المومنین علیہ السلام۔ راوی نے عرض کیا یہ تنزیل ہے؟ حضرت نے فرمایا ہاں اس روایت میں حضرت نے امیر المومنینؑ کا نام یعنی کی لفظ کے ساتھ ذکر کیا جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جزء قرآن نہیں ہے بلکہ بیان مراد اور ھذا کی لفظ کے اصلی مشار الیہ کے طور پر ہے۔ اب سائل کا یہ پوچھنا کہ یہ تنزیل ہے؟ اور حضرت کا فرمانا کہ ہاں اس سے صاف ظاہر ہے کہ تنزیل سے مراد جزء قرآن ہی نہیں ہوا

کرتا تھا بلکہ جو چیز قرآن کی کسی آیت میں خصوصیت کے ساتھ مراد ہو اس کو وہ حضرات تنزیل کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

یہ روایت اور اس کی ایسی دوسری روایتیں تمام ان دلائل کو ختم کر دیتی ہیں جن سے فصل الخطاب کے اوراق پر کئے گئے ہیں۔

اور ان روایات کی حقیقت بھی اس سے پہلے کھولی جا چکی ہے اور انہی مطالب کی طرف جو ہم نے بیان کیے علمائے اعلام کے کلمات میں جو ہم نے نقل کیے تھے اشارہ موجود ہے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ یہ روایت ضعیف السند ہے اور اسی طرح بعض اس کے قبل کے روایات تو ہم جواب میں کہیں گے اکثر روایتیں جنہیں فصل الخطاب نے نقل کیا ہے وہ ایسی ہی یا اس سے زیادہ ضعیف السند ہیں اس کے علاوہ ہم نے جو صحیح السند روایتیں پیش کی ہیں وہ کیا کم ہیں اور وہ اثبات مطلب کے لئے کافی ہیں ان لوگوں کے واسطے جو صاحبان عقل و تمیز ہوں۔

(۴)

قرآن مجید کی قرأت

قرآن مجید کے آیت کی مادی اور صوری حیثیت اور عام طور پر جو اس کے پڑھنے کا طریقہ ہے وہ نسل در نسل چودہ سو برس میں برابر مسلمانوں کے اندر محفوظ و برقرار رہا ہے اور قراء سبع یا ان کے علاوہ دوسرے قاریوں کی قرائتیں جو کتابوں کے اندر درج ہیں کبھی عمومی حیثیت سے اس پر اثر انداز نہیں ہوئیں اور نہ صحیح بخاری اور مسند حاکم وغیرہ میں مختلف صحابہ کی زبانی جو بکثرت مختلف قراءتیں ہیں جنہیں کنز العمال میں درج کیا گیا ہے اس عمومی انداز قراءت کو متاثر بنا سکیں۔

پھر یہ کہ یہ سات یا مزید اضافہ کے ساتھ دس قراءتیں جتنی ہیں وہ بعض الفاظ کی صورت سے بس تعلق رکھتی ہیں نہ یہ کہ وہ کسی لفظ کی کمی یا زیادتی کو بتاتی ہوں اور اس کے بعد بھی وہ آحاد کی روایتیں ہیں دوسرے اشخاص آحاد کی زبانی جن سے کوئی گمان بجائے خود بھی بحد وثوق و اطمینان پیدا نہیں ہوتا چہ جائیکہ خود وہ آپس کے تعارض و اختلاف کی وجہ سے کمزور بھی ہیں اور پھر اس رسم الخط کے خلاف ہیں جو عام مسلمانوں کے درمیان ایک ہزار برس سے زیادہ کی طولانی مدت میں قائم و برقرار رہا ہے اور قراء سبعہ میں سے ہر ایک صرف ایک راوی کی حیثیت رکھتا ہے جس کی عدالت اور وثاقت بھی ثابت نہیں ہے او وہ ایسے ایسے احاد سے روایت کرتا ہے جن میں زیادہ تر اسی کی ایسی حیثیت رکھتے ہیں اور پھر خود ان کے بعد ان سے روایات کرنے والے بھی اسی قسم کے اشخاص ہیں چناں چہ عاصم کے دو شاگرد ہیں جن کے ذریعہ سے عاصم کی قراءت کا دنیا کو علم ہوا ہے مگر خود ان دونوں میں عاصم کی قراءت کے متعلق اکثر اختلاف ہوتا ہے کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ۔

اس طرح نافع کے دو شاگرد ابن کثیر سے روایت کے سلسلہ میں ایسا ہی ہے۔

اور ابوعمر بن العلا کے صرف ایک شاگرد یزیدی اور ان کے دو شاگرد ابوعمرو اور ابوشعیب۔

☆ابن عامر سے سلسلہ روایت میں کچھ دوسرے اشخاص کے واسطہ سے ذکوان اور ہشام

☆حمزہ کے ایک شاگرد سلیم اور ان کے دو ۲ راوی خلف اور خلاد

☆کسائی کے بھی دو ۲ راوی ابوعمر اور ابوالحارث

اب جبکہ ہر طبقہ میں سے ایک اور دو راوی ہوتے رہے اور وہ بھی باہمی اختلاف کے ساتھ تو تواتر کا دعوی بے بنیاد نہیں تو کیا ہے؟

پھر یہ کہ ان آحاد قراءتوں کی سندوں میں سے کوئی اہلسنت کے اصطلاح کے مطابق بھی صحیح کی تعریف میں داخل نہیں ہے چہ جائیکہ مذہب امامیہ کے معیار پر اس کے بعد نہایت حیرت ناک ہے کسی کا یہ کہنا کہ یہ ساتوں قراءتیں تواتر کا درجہ رکھتی ہیں اور یہ قاری عموماً تھوڑے سے فرق سے باوجود زیادہ تر اس رسم الخط کے موافق رہتے ہیں جو عام طور پر رائج ہے سوا شعبہ کی زبانی والی عاصم کی قراءت کے جو کبھی کبھی اس سے الگ ہوتی ہے اس لئے اس رسم الخط سے جو عموماً قرآن کا ہے برطرف کر کے کسی دوسرے انداز سے پڑھنا کسی طرح درست نہیں ہے خصوصاً جبکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ:

اِقْرَءُوْا كَمَا يَقْرَأُ النَّاس............اس طرح پڑھو جس طرح لوگ پڑھتے ہیں

اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو عام طریقہ قراءت کا ہے اس سے انحراف نہ کرو۔

ممکن ہے کہ کوئی کہے کہ سات یا دس قراءتیں جو ہیں، وہ زیادہ تر کسی لفظ کی شکل

وصورت میں عربی صرف واشتقاق کے مختلف طریقوں یا لغوی معنی کے لحاظ سے کچھ تبدیلیوں سے متعلق ہیں۔ جیسے: علیھم الیھم اور لدیھم میں ھم کی ھ (ہ) کو کسرہ دیا جائے یا ضمہ اور تظاھرون کی لفظ میں ظ تشدید کے ساتھ یا بغیر تشدید کے تو ان میں جس قراءت کے بھی مطابق پڑھیں اسے صحیح ہونا چاہئے مگر حقیقت میں تلاوت قرآن تو یہ ہے کہ جو لفظ بصورت وحی رسولؐ اتری ہوا سے پڑھا جائے نہ یہ کہ اپنے عربی قواعد کے معلومات کی بناء پر جس جس طرح وہ لفظ صحیح ہوتا ہو اس طرح اس کا ادا کرنا لہذا ہمیں یقین نہیں تو قوی سے قوی گمان اس لفظ کا حاصل کرنا ہے جو رسولؐ پر نازل ہوئی تھی اور وہ اس طریقہ پابندی سے وابستہ ہے جو عام مسلمانوں میں صدر اول سے اب تک رائج رہا ہے۔

رہ گیا ان قراءتوں کے اعتبار کے لئے سبعۃ احرف والی حدیث سے استناد، وہ انتہائی کمزور ہے۔

اول تو نزل القرآن علی سبعۃ احرف والی حدیث اپنے لفظ ومعنی کے اعتبار سے اس درجہ مبہم مضطرب اور تاریک ہے کہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں اس کے معنی درج کرتے ہوئے لکھ دیا ہے کہ:

اختلف فی معنی سبعۃ احرف علی اربعین قولا.

اس سات حرفوں کے معنی میں چالیس مختلف قول وارد ہوئے ہیں

ان میں پینتیس ۳۵ قول ابن حیان کی کتاب سے درج بھی کئے ہیں اس کے بعد پھر خود حافظ سیوطی نے لکھا ہے:

وقد ظن کثیر من عوام ان المراد بها القراءات السبعة وھو جھل قبیح.

اور بہت سے عوام نے یہ گمان کیا ہے کہ اس سے مراد ساتوں قراءتیں ہیں اور

یہ بہت بری جہالت کا مظاہرہ ہے

دوسرے یہ کہ مستدرک حاکم میں ان شرائط صحت کے ساتھ جو صحیحین کی حدیثوں کا معیار ہیں ابن مسعود کی روایت ہے حضرت پیغمبرؐ خدا سے کہ:

نزل القرآن من سبعۃ ابواب علیٰ سبعۃ احرف زاجراً واٰمراً وحلالاً وحراماً ومحکماً ومتشابہاً وامثالاً.

قرآن مجید سات بابوں کے قبیل سے سات حرفوں پر نازل ہوا ہے ممانعت ہے، حکم ہے، حلال ہے، حرام ہے، محکم ہے، متشابہہ ہے اور امثال ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سات حرفوں سے مراد سات باب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں آیات موجود ہیں۔

اسی کے مطابق ابن جریر کی روایت میں ابو قلابہ کی زبانی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

انزل القراٰن علیٰ سبعۃ احرف امر و زاجر و ترغیب و ترھیب وجدل وقصص ومثل.

قرآن مجید سات حرفوں پر نازل ہوا ہے امر نہی، ترغیب، تہدید، بحث، مباحثہ، قصص اور امثال

اور ابن جریر سنجری ابن المنذر اور ابن الانباری نے ابن عباس کی زبانی حضرتؐ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ:

اِنَّ الْقُرْاٰن علیٰ اربعۃ احرف حلال وحرام. الخ

قرآن چار حرفوں پر ہے حلال، حرام وغیرہ

اور سنجری نے کتاب ابانہ میں حضرت علیؑ سے روایت کی ہے:

انزل القراٰن علیٰ عشرۃ احرف بشیر و نذیر و ناسخ و منسوخ وعظۃ ومثل ومحکم ومتشابہ وحلال وحرام.

قرآن دس حرفوں پر اتارا گیا ہے خوشخبری تخویف وتحدید، ناسخ ومنسوخ، موعظہ وامثال، محکم ومتشابہہ اور حلال وحرام

تیسرے اہلسنت کی کتابوں میں ان کے معیار پر بہت عمدہ سندوں کے ساتھ ایسی حدیثیں اس سلسلہ میں ہیں جو قطعی نا قابل قبول اور عقلی طور پر واہیات اور خرافات میں داخل ہیں جیسے احمد بن حنبل کی روایت ابو بکرہ سے کہ حضرت رسولؐ خدا نے تقاضہ کر کے جبرائیلؑ سے قرآن کی قراءت کے الفاظ میں ردوبدل کی اجازت حاصل کی یہاں تک کہ سات حرفوں تک تعداد پہونچی جبرائیلؑ نے کہا:

کلّہا شاف کاف مالم تختم اٰیۃ عذاب برحمۃ واٰیۃ رحمۃ بعذاب.

یہ سب طریقے کافی اور شافی ہیں جب تک آیت عذاب کو رحمت پر اور آیت رحمت کو عذاب پر ختم نہ کیا جائے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنی چاہے الفاظ میں تبدیلیاں ہوجائیں بس اتنا نہ ہو کہ آیت عذاب آیت رحمت اور آیت رحمت آیت عذاب ہو جائے۔ دوسری حدیث میں ان جائز تغیرات کی مثال بھی دی گئی کہ جسے **تعال** کی جگہ **اقبل ھلم اذھب** اور **اسرع** کی جگہ **اعجل** وغیرہ

☆ اسی طرح کی روایت طبرانی نے ابو بکرہ سے اور احمد وطبرانی دونوں نے ابن مسعود سے نقل کی ہے۔

☆ ابوداؤد کی حدیث میں ہے:

لیس منها الاّ شاف کاف ان قلت سمیعا علیما. عزیزا حکیما مالم تختم اٰیة عذاب برحمة بعذاب.

یہ سب طریقے شافی وکافی ہیں اگر تم سمیعا علیما کہو یا عزیز احکیما کہو جب تک کہ آیت عذاب کو رحمت سے اور آیت رحمت کو عذاب سے بدلا نہ جائے۔

☆ ابن جریر نے ابو ہریرہ کی زبانی حضرتؐ سے روایت کی ہے:

اِنَّ ھٰذا القراٰن نزل علیٰ سبعة احرف فاقرؤ ولا حرج ولٰکن لا تجمعوا ذکر رحمة بعذاب ولا ذکر عذاب بمغفرة.

یہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے لہٰذا تم شوق سے خاطر خواہ پڑھو کوئی مضائقہ نہیں ہے بے شک رحمت اور عذاب کی آیتوں کے خلط ملط نہ کرو۔

☆ اور احمد بن حنبل نے عمر کی حدیث درج کی ہے کہ:

القراٰن کله صواب مالم تجعل مغفرة عذابا او عذابا مغفرة.

قرآن جس طرح بھی پڑھو ٹھیک ہی ہوگا جب تک کہ مغفرت کو عذاب اور عذاب کے مغفرت نہ بنادو۔

ان روایت کے لحاظ سے قرآن کی شان اعجاز تو بالکل بے حقیقت چیز ہو جاتی ہے اور سوا ایک محدود تبدیلی کے جس کی ممانعت کی گئی ہے باقی ہر طرح کی تحریف کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے جس کے بعد سالمیت قرآن کی لفظ کے معنی کوئی نہیں رہتے۔ چوتھے معتبر کتب اہل سنت میں ایسے تصریحات موجود ہیں جن سے اختلاف قراءت کی کوئی صحیح بنیاد باقی نہیں رہتی جیسا کہ ابن انباری نے یہ صراحت درج کی ہے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، زیدؓ

بن ثابت اور تمام مہاجرین وانصار کی ایک ہی قرائت تھی اور ابن ابی داؤد نے سند متصل کے ساتھ انس سے روایت کی ہے انہوں کہا کہ میں نے حضرت پیغمبر خدا ﷺ اور ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ سب کے پیچھے نماز پڑھی ہے وہ سب مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ پڑھتے تھے اور یہ بھی روایت لکھی ہے کہ سب سے پہلے جس نے مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ پڑھا وہ مروان بن حکم تھا۔

پانچویں جو فیصلہ کن چیز اس بحث میں ہے، وہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے جو بطریق شیعہ سند متصل کے ساتھ کافی میں وارد ہے۔

اِنَّ القراٰن واحد نزل من عند واحد ولٰکن الا ختلاف یجیٔ من قبل الرُّواة.

قرآن بس ایک ہے اور ایک ذات کے پاس سے نازل ہوا ہے مگر اختلاف پیدا ہوتا ہے مختلف راویوں کی وجہ سے

اور صدوقؒ نے اپنے اعتقادات میں بطور مرسل امام جعفر صادقؑ سے روایت کی ہے اور کافی میں بطور صحیح فضیل بن یسار سے منقول ہے کہ:

قلتُ لابی عبداللهؑ اِنَّ النَّاس یقولون اَنَّ القراٰن نزل علیٰ سبعة احرف فقالؑ کذبوا ولٰکنهٗ نزل علیٰ حرف واحد من عند الواحد.

میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا لوگ کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے حضرت نے فرمایا وہ جھوٹے ہیں بلکہ وہ ایک حرف پر نازل ہوا ہے ایک ذات کی جانب سے اور اس کی موید سیاری کی روایت بھی ہے جو امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ دونوں سے ہے۔

(۵) اصول تفسیر

اس سلسلہ میں چند پہلو قابل تبصرہ ہیں

(۱) مفرد الفاظ اور عربی زبان میں ان کے معانی کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید عربی زبان کی سب سے زیادہ فصیح سب سے زیادہ عام عربوں میں رائج اور مانوس بولی میں اترا تھا لہٰذا عام طور پر اس کے تحت لفظی معانی قوم عرب کے افراد سے پوشیدہ نہ تھا سوا شاذ و نادر بعض الفاظ کے جو کسی سبب سے بعض افراد کو معلوم نہ ہو۔ جیسا کہ سورعبس میں ارشاد الٰہی ہے۔ وَفَا كِهَةً وَّ اَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا. مگر جب غیر عرب دوسری قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں اور آپ کے میل جول سے امتداد زمانہ کے ساتھ خود عرب زبان میں تبدیلیاں ہوگئیں تو اب بہت ایسے الفاظ ہو گئے جو نزول قرآن کے وقت عام فہم تھے اور اب عربی روز مرہ والی زبان کے بدل جانے سے وہ الفاظ غیر عام فہم ہو گئے یہاں تک یہ واقفیت کی کمی خواص یعنی زمرہ علماء میں شمار ہونے والے اشخاص تک بھی پہونچ گئی تو اب کتب لغت سے مدد لی جانے لگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ مفردات الفاظ کو لغت اور محاورہ کے مطابق حل کرنے کی بنیاد زیادہ تر ذاتی حیثیت سے عربی ادب کی مزاولت اور موارد استعمال کے تتبع پر قائم ہونا چاہئے صرف کتب لغت میں دیکھ لینے سے صحیح نقطہ حقیقت کے پہنچنا جوئے شیر لائے سے کم نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ہم ایک معمولی لفظ لمس اور اس کے ساتھ لفظ مس کو دیکھتے ہی اس میں لغت کی کتابوں میں وہ گڈ مڈ یا گڑ بڑ ہے جس کے بعد لغت سے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

نہایۃ اللّغۃ میں ہے لفظ مس کے معنی ہیں:

مست الشئ اذا لمسته بيدك.

کہا جاتا ہے میں نے اس چیز کو مس کیا جبکہ اپنے ہاتھ سے اس کا لمس کیا ہو

اب قاموس میں لمس کے معنی دیکھئے تو ملے گا:

لمسه مسته بيده و مسسه اى لمسه.

اسے لمس کیا یعنی اپنے ہاتھ سے مس کیا اور میں نے اسے مس کیا یعنی لمس کیا

اور مصباح میں ہے:

مسته افضيت اليه يدى من دون حائل هٰكذا قيّدوه.

میں نے اسے مس کیا یعنی اپنا ہاتھ اس تک پہنچایا بغیر کسی کے اس طرح اس میں قید لگائی ہے

اور اس کے قبل لکھ چکے ہیں:

لمسه افضى اليه باليد هٰكذا فسّروه

اسے لمس کیا یعنی ہاتھ اس تک پہنچایا اس طرح اس کی تفسیر ہوئی ہے

ابن درید نے کہا ہے:

اصل اللمس باليد للمتصرّف منَ الشّئ.

لمس دراصل ہاتھ سے ہوتا ہے کہ کچھ اس چیز کو پہچانا جائے

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ:

لمست مسست و كل ماسّ لامس.

''میں نے لمس کیا''، یعنی میں نے مس کیا اور ہر مس کرنے والا لمس کرنے والا ہے۔

اور فارابی نے کہا ہے کہ لمس مس ہے اور تہذیب میں ابن الاعرابی سے منقول ہے کہ لمس کسی شے کا مس کرنا ہے اور مس کو لکھا ہے کہ مس کے معنی ہیں کسی شے کا مس کرنا ہاتھ

سے جوہری نے کہا ہے کہ لمس کے معنی ہیں مس پھر مصباح میں حل لغت کے بعد لکھا ہے:

اِذَا کَانَ اللَّمس هُوَ الْمَس فَکَیْفَ یَفْرَقُ الْفُقَهَاءُ بَیْنَهُمَا.

جب کہ لمس اور مس ایک چیز ہے تو معلوم نہیں فقہاء ان دونوں میں فرق کیوں قرار دیتے ہیں؟

مگر حقیقت یہ ہے کہ فقہاء معانی الفاظ کو صحیح طور سے سمجھنے میں ان لغویین سے زیادہ نظر رکھتے ہیں اس لئے کہ ان کی عمریں گزرتی ہیں کتاب وسنت کی سیر اور کلام عرب کے تتبع میں انہوں نے بہت خوب سمجھا ہے اور ٹھیک کہا ہے کہ لمس اور مس دونوں میں باعتبار معنی کے فرق ہے۔

''لمس'' کسی شے کا خاص طور سے چھونا ہے ایک ایسے حصہ جسم سے اپنے کہ جس میں احساس کی طاقت ہو خاص طور پر چھونے کا مطلب یہ ہے کہ چھونا اسی قصد سے ہو کہ اسے شے کا احساس کیا جائے صرف ہاتھ سے چھونے کی خصوصیت نہیں ہے مگر ہر طرح سے چھونے کی تعمیم بھی نہیں ہے اگر کسی اور حصہ جسم سے اس مقصد سے چھوا جائے کہ احساس حاصل ہو تو وہ بھی لمس ہوگا لیکن اکثر یہ لمس ہاتھ ہی کے ذریعہ سے ہوتا ہے کیوں کہ وہ آسان ذریعہ ہے اور اس کا احساس زیادہ قوی ہے۔ مگر ''مس'' کے معنی ہیں چھوجانا دوسری شے کا اس میں قصد احساس کی خصوصیت نہیں ہے اور ہاتھ کے ذریعہ سے ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو شخص موارد استعمال کا تتبع کرے وہ تصدیق کرے گا کہ لمس اور مس کے یہی معنی ہیں جو تحریر ہوئے ہیں اور لغویین کی ایک بات بھی ٹھیک نہ تھی۔

اس کی دوسری مثال لفظ توفی ہے کہ اس میں اہل لغت کے کلمات میں بڑا اضطراب ہے کسی نے اس کے معنی آمَاتَهٗ ''موت دینا'' لکھ دیئے اس کے اتباع میں اکثر مفسرین نے سورہ آل عمران کی آیت یَا عِیْسٰی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ میں یہ

معنی لکھ دیئے کہ ''اے عیسیٰ میں تمہیں موت دینے والا ہوں'' کسی نے کہا اُمِیْتُكَ حتف انفك ''تمہیں ایسا کروں گا کہ اپنی موت مرو''۔ کسی نے اس کے ساتھ اپنے عقیدہ حیات مسیحؑ کو سنبھالتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ

مُمِیْتُكَ فِیْ وَقْتِكَ بعد النزول من السّمآء.

تمہیں موت دی جائے گی تمہارے وقت پر آسمان سے اترنے کے بعد

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے نہ اس لفظ کے فلسفہ لغوی پر نظر ڈالی نہ اس کے ''مبدا'' اشتقاق پر نہ ''انقلاب تعریفی'' پر نہ قرآن مجید کے محاورات پر نہ عرب کے استعمالات پر ورنہ ہرگز ہرگز وہ توفی کے معنی موت کے نہ قرار دیتے اور واقعہ یہ ہے کہ کسی ایک جگہ بھی قرآن یا غیر قرآن میں ''توفی'' بمعنی موت نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہیں لینا اور پورا کرنا یہ کبھی موت کی صورت سے ہوتا ہے، کبھی نیند کی صورت سے اسی طرح کبھی زندہ زمین سے آسمان پر اٹھا لئے جانے کے ساتھ ہوسکتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس لفظ کا استعمال جس جس انداز سے ہوا ہے وہی اس حقیقت کے اظہار کے لئے کافی ہے جیسا کہ سورہ زمر میں ہے:-

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا ۚ فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْهَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی. (زمر۔ ۴۲)

اللہ توفی کرتا ہے نفوس کی ان کی موت کے وقت اور جنہیں موت نہیں آئی ہے ان کے سونے کے عالم میں تو روک لیتا ہے اس کو جس پر موت کا فیصلہ ہوا ہے اور بھیج دیتا ہے واپس دوسرے نفس کو ایک خاص مدت تک کیلئے۔

یہاں اگر یوں معنی کہے جائیں کہ اللہ نفوس کو ان کی موت کی صورت میں موت

دیتا ہے تو کوئی معقول بات نہ ہوگی اور پھر مزید برآن کہ جسے موت نہیں آئی ہے اسے اس کی نیند کے عالم میں موت دیتا ہے یعنی چہ؟

اسی طرح ارشادِ الٰہی سورۂ انعام میں ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ. (انعام۔ ۶۰)

اور وہ، وہ ہے جو رات کو تمہاری توفی کرتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم نے دن کو کیا ہے پھر وہ دن میں تمہیں اٹھاتا ہے تاکہ مقررہ مدت پوری ہو پھر اسی کی طرف تمہارا پلٹنا ہوگا۔

یہاں بھی رات کو توفی کرنے کے معنی ہیں نیند کا طاری کرنا پھر اللہ بیداری کی صورت میں انہیں دن آنے پر اٹھاتا ہے تاکہ جو عمریں ان کی مقررہ ہیں انہیں پورا کرے پھر آخر میں مرنے اور قیامت میں اٹھائے جانے کی صورت سے اللہ کی طرف انہیں پلٹنا ہوتا ہے۔

اور جیسے کہ سورہ نساء میں ارشاد الٰہی ہے۔ (آیت۔ ۱۵)

حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ. یہاں ہم اگر یہ ترجمہ کریں کہ موت انہیں موت دے تو کوئی معنی نہ ہوں گے معنی اس کے وہی ہیں کہ موت ان کی مدتِ عمر کو پورا کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن اور غیر قرآن عرب کے کلام میں جہاں توفیٰ یا اس سے مشتق الفاظ آئے ہیں تو اس کے کسی شے کو پورا پورا لینے ہی کے معنی ہوتے ہیں جیسا کہ سکوں میں ''درہم وافی'' کا محاورہ ہے یعنی وہ سکہ جس میں کچھ کمی نہیں ہے اور یہ معنی توفی کے اہل لغت نے بھی درج کیے ہیں اور کہا ہے کہ توفاہ اور استوفاہ کے ایک ہی معنی ہیں اور

اس کا شاہد شاعر کا یہ قول ہے:

ان بنی الادرد لیسوا الاحد ولا توفّاھم قریش فی العدد.

بنوادرد کسی کی ملکیت نہیں ہیں اور نہ قریش تعداد میں ان کی توفی کر سکتے ہیں یعنی ان کو پورا پورا لے نہیں سکتے لیکن میں کہتا ہوں کہ استیفا اور توفیٰ کے معنی میں اشتقاق کے زیر اثر ایک فرق نمایاں ہے۔

استیفاء باب استفعال کا مصدر ہے جیسے استخراج اس میں تدابیر کے ساتھ کسی شے یا مطالبہ کا پورا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے اور توفی معنی میں کسی شے کا پورا حاصل کرنا نکلتا ہے قدرت کے ساتھ اس میں تدابیر کا ہونا ظاہر نہیں ہوتا اور اخذ کے معنی بس لینے کے ہیں اس میں پورے کا مفہوم نہیں ہے۔

اس آیت میں کہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا میں یتوفّٰی فعل ہے جس کا مفعول الانفس معطوف علیہ ہے اور اسی پر اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ کا عطف ہے اسی طرح ایک لفظ توفی یتوفی دو ۲ سے متعلق ہے ایک انفس اور دوسرے اَلَّتِيْ لَمْ تَمُتْ اب اگر یتوفی کے معنی لیں ''موت دیتا ہے'' تو الانفس تعلق کے ساتھ تو یہ معنی بن جائیں گے کہ نفوس کو موت دیتا ہے۔ مگر جنہیں موت نہیں آئی، اُنہیں موت دیتا ہے اس کے کیا معنی؟

کوئی کہے کہ وہاں توفیٰ کے معنی بطور مجاز زندہ اٹھا لینے کے لئے لیں گے مگر جب یتوفی کا لفظ ایک ہے تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے کہ ایک مفعول کے ساتھ تعلق میں اس کے کچھ معنی ہوں اور دوسرے مفعول کے ساتھ اس کے معنی کچھ اور ہوں۔ اور حقیقت امر وہی ہے کہ توفٰی کے ایک عام معنی ہیں اور وہ کسی شے کو پورا پورا لے لینا ہے خواہ عالم زندگی سے الگ کر کے یا عالم بیداری سے یا زمین اور اس دنیا کی اجتماعی زندگی سے علیحدہ کر کے

آسمان کی طرف اٹھا کر جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے لئے ہوا۔

(۲) مفردات الفاظ کے حل کر چکنے کے بعد دوسری منزل ان الفاظ کے باہمی ارتباط پر نظر کرنا ہے۔ اس کا تعلق علم نحو سے ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اس میں بھی نحویوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے زیادہ ذاتی محاورات کے مطالعہ اور عربی کلام کے اسلوب سے انس اور واقفیت پر دار و مدار ہونا چاہئے۔

علم نحو کی کتابیں اس وقت کے لئے خوب ہیں جب کہ انسان عربی سے ناشناس ہو اور عربی زبان کو حاصل کرنا چاہ رہا ہو۔ اس وقت کے لئے نحو کی بنیادی قواعد بیشک ایسے ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر اسے آگے بڑھانا اور تحصیل علم عربی میں مصروف ہونا چاہئے لیکن جب انسان کو ملکہ عبارت کے سمجھنے اور صحیح پڑھنے کا پیدا ہو گیا اب اس کو نحو کی کتابوں اور نحویوں کی دور از کار باتوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا وہ جتنا آگے بڑھتا ہے سیر وتتبع کلام فصحاء میں اس کے سامنے نئے نئے اسلوب پیش کرتا جاتا ہے جو ان حدود سے بالکل آگے ہے جن تک نحوی لوگ پہنچ سکے ہیں۔

یعنی سمجھنا چاہئے کہ نحوین کی بہت سی باتیں بالکل ڈھکو سلے کی ہوتی ہیں جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

مثلاً ایک شاعر کا مصرع ہے:

جاءوا بمذق هل رايت الذئب اقط

’’لائے وہ دودھ جس میں پانی ملا ہوا تھا، کیا تم نے بھیڑیا کبھی دیکھا ہے‘‘۔

یہ ایک خاص انداز کلام ہے جس سے زبان شناس افراد لطف اٹھا سکتے ہیں۔

اب ہمارے نحوی اصحاب اس کی ترکیب کہنے بیٹھے الفیہ کے شارحین نیز دوسری نحوی کتابوں کے مصنف لکھتے ہیں کہ اس کلام کی تقدیر یوں ہے:

جاءوا بمذق مقول فيه هل رأيت الذئب قط.

وہ لوگ ایسا پانی ملا ہوا دودھ لائے جس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

اب خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس توجیہ سے بیچارے شاعر کی روح پر کیا گذری؟

وہ تو دودھ کی رنگت کی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ رنگ پیش نظر ہو جائے جو پانی کی کثرت سے دودھ میں نظر آ رہا تھا اس نے یہ الفاظ ایک خاص مصوری کے انداز پر کہے تھے ذی علم محقق ارباب نحو نے ترکیب نحوی کی فکر میں اس کو یوں کہا کہ ’’دودھ ایسا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟‘‘ ’’یہ‘‘ ’’کبھی بھیڑیا دیکھا ہے۔‘‘ اس کلمہ مقدر مقول فیہ‘‘ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کے ذریعہ سے دودھ کی صفت قرار پا گیا لیکن کیا اس طرح شاعر کا اصلی مقصود حاصل ہوتا ہے کیا شاعر یہی کہنا چاہتا تھا؟ نہیں ہرگز نہیں آخر دودھ کے بارے میں اس کے کہے جانے کے کیا معنی کبھی بھیڑیا دیکھا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ **هل رايت الذيب قط** تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے بالکل مستقل استفہامی جملہ ہے جس کی سابق کلام کے ساتھ ترکیبی حیثیت سے کوئی آویزش نہیں ہے وہ صرف ظاہر کرنے والا ہے دودھ کی ایک صفت کو جو شاعر کے ذہن میں ہے کلام کا جزء نہیں ہے وہ یہ کہ **لونه کلون الذئب** دودھ ایسا تھا کہ جس کا رنگ ہو بہو بھیڑیے کا سا تھا اس کو دل میں رکھ کر اس نے سامعین کے ہر فرد سے سوال کیا ہے **هل رايت الذئب قط** تم نے کبھی بھیڑیا دیکھا ہے یعنی اگر تم نے دیکھا ہو تو تم تصدیق کرو گے کہ بیشک دودھ اسی رنگ کا ہے۔

اب دیکھیے کہ یہ معنی کہیں بھی نحوین کی ساختہ و پرداختہ ترکیب سے پیدا ہوتے ہیں؟

نحویین کے اس طرح کے ڈھکوسلوں کی آماجگاہ قرآن مجید کی آیتیں بھی بنی ہیں

جس کی مثال ایک یہ ہے کہ قرآن میں متعدد جگہ لَآ اُقْسِمُ کا لفظ ہے فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ۔لَآ اُقْسِمُ بِھٰذَا الْبَلَدِ۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ وغیرہ وغیرہ

ان آیات کی تفسیر میں جار اللہ زمخشری ایسا متبحر عالم نحو ولغت ایسا گھبرایا ہوا نظر آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

پہلی آیت:

☆فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ ○وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ

(سورہ واقعہ) میں نہیں قسم کھاتا ستاروں کے غروب ہونے کے مقامات کی حالانکہ یہ قسم اگر تم جانو بہت عظیم ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ لا اقسم کے معنی ہیں اقسم قسم کھاتا ہوں اور لا زائد ہے جیسے

دوسری آیت:

☆لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں زائد ہے۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ: میں نہیں قسم کھاتا روز قیامت کی اور نہیں قسم کھاتا انسان کے نفس کی جو معصیتوں پر ملامت کرتا ہے یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ لائے نافیہ کا آنا فعل قسم پر کلام عرب میں بہت شائع وذائع ہے مثلاً امرالقیس نے کہا ہے:

''لَا وابیك ابنة العامری لَا یدّعی القوم انی افر''۔ ''نہیں قسم تیرے باپ کی اے عامری لڑکی! قوم والے نہیں دعویٰ کر سکتے کہ میں جنگ سے فرار کرتا ہوں''۔

غویہ بن سلمہ نے کہا ہے:

الا نادت امامة باحتمال لتحزننی فلا بك لا ابالی

''امامہ (شاعر کی معشوقہ) نے اعلان کیا ہے کہ وہ اب کہیں اور روانہ ہو جائے گی تا کہ مجھے رنج پہنچائے تو نہیں قسم تمہاری میں کوئی پرواہ نہیں کروں گا۔

اس کلمہ ''لا'' کا فائدہ قسم میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ زائد ہوتا ہے جیسے: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ۔ پھر ادھر ادھر کی کچھ باتوں کے بعد جو نا قابل قبول ہیں کہتے ہیں حق یہ ہے کہ لانفی ہی کے لئے ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں اس شے کی قسم اس کو عظمت عطا کرنے کے لئے نہیں کھاتا ہوں۔ اس کی دلیل ہے یہ آیت:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ، گویا حرف نفی کے داخل کرنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ میرا قسم کھانا اس شے کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے قسم نہ کھانے کے برابر ہے کیوں کہ وہ شے خود ہی عظیم ہے۔

یہ جناب زمخشری کا کلام عجیب وغریب ہے کہاں فعل قسم یعنی اُقْسِمُ یعنی قسم پر لائے نفی کا داخل ہونا جیسا کہ قرآن کی محل بحث آیت میں ہے اور کہاں امرالقیس اور غویہ بن سلمہ کے کلام میں حرف نفی یعنی ''لا'' کا حرف قسم یعنی ''و'' اور ''ب'' کے پہلے آجانا اور پھر قسم کے بعد اس لا کا دہرایا جانا جو شاہد میں پیش کیا گیا ہے۔

ان اشعار میں لا کا قسم سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ وہ اس منفی جملہ کا جو قسم کے ساتھ کہا جا رہا ہے اور بعد میں بطور جواب قسم آنے والا ایک جزء ہے جسے بطور تاکید دہرانے کے لئے ایک دفعہ قسم سے پہلے لایا گیا ہے اور دوسری دفعہ فعل منفی کے ساتھ بعد قسم اس کی نظیر قرآن مجید کی اس آیت میں ہے کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ.

(نساء۔۶۵)

تونہیں خدا کی قسم وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے نزاعات میں آپ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوں

اس کو کیا نسبت اس کلمہ ''لا'' سے جو خود فعل قسم پر داخل کیا گیا ہو جیسا لَآ اُقْسِمُ والی آیتوں میں ہے۔

تیسری آیت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ. (حاقہ۔۳۸۔۳۹)

میں نہیں قسم کھاتا ان چیزوں کی جو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کو جو تم نہیں دیکھ سکتے

اس کی تفسیر میں لکھا ہے ''یہ قسم ہے تمام اشیاء کی'' سورہ بلد میں ہے۔

چوتھی آیت

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ.

''میں نہیں قسم کھاتا اس شہر کی'' اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ''قسم کھاتا ہوں''

اسی طرح سورہ مَعَارِج تَكْوِيْر اور اِنْشِقَاق میں لَآ اُقْسِمُ کے معنی اُقْسِمُ کے قرار دیئے ہیں۔

دوسرے مقامات جہاں حرفوں کو زائد کہا گیا ہے: مثلاً: سورۂ حدید میں: لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ۔ اس کے معنی زمخشری نے قرار دیئے ہیں لیعلم اهل الكتب ''تا کہ اہل کتاب کو معلوم ہو'' دوسرے کچھ علماء نے بھی زمخشری کی ہمنوائی فرمائی ہے۔

افسوس ناک نتیجہ:

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنان قرآن کو قرآن پر اعتراض کا موقع مل گیا کہ اس میں بھرتی کے زائد الفاظ ہیں مگر کتاب ''الہدی الی دین'' کے حصہ اول صفحہ ۳۵۴ و ۳۵۵ میں زیادتی الفاظ کے اس تصور کا بطلان ثابت کیا گیا ہے اور تمام آیتوں میں لا کے معنی بتائے گئے ہیں مثلاً سورہ حدید کی آیت:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(حدید۔۲۸۔۲۹) (سپارہ۔۲۷)

اے ایمان لانے والو! تقویٰ اختیار کرو اور اس کے رسول کا اقرار کرو تو وہ عطا کرے گا تمہیں دہرا حصہ اپنی رحمت کا اور قرار دے گا تمہارے لئے ایک روشنی جس کی مدد سے راستہ طے کرو گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کرے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے مہربان تا کہ نہ سمجھیں اہل کتاب کہ وہ لوگ، (جو ایمان لائے) کچھ قدرت نہیں رکھتے، اللہ کے فضل و کرم کے کسی جزء پر بھی اور بلاشبہ فضل و احسان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اس آیت میں یہ لوگ لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں لا کو زائد مانتے ہیں

اوراس کے معنی یہ قرار دیتے ہیں کہ ''تا کہ معلوم ہوا اہل کتاب کو''۔

ان لوگوں کی آخر سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ خدا کو اس کی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس کو کہنا ہو کسی بات کے بارے میں کہ وہ اس طرح ہے مگر وہ اس میں نفی کا کلمہ بڑھا کر جملہ ایسا کہہ دے جس کے معنی یہ ہوں کہ ایسا نہیں ہے! یہ صرف معنی میں عدم تدبیر کا نتیجہ ہے اگر غور سے کام لیتے تو معلوم ہوتا کہ لا زائد نہیں ہے وہ نفی کے معنی رکھتا ہے اور وہ نفی مقصود متکلم کا جزء ہے۔

مطلب آیت کا گنجلک بھی نہیں ہے۔ بالکل صاف ہے جو آیت کے پہلو میں درج شدہ ترجمہ سے ظاہر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اہل ایمان تقویٰ اختیار کریں گے تو خدا کی خاص رحمتوں سے سرفراز ہوں گے اور وہ ان کو نور عطا کرے گا اور ان کی مغفرت کرے گا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ غیر مسلمین، یہود و نصاری جو اس وقت مسلمانوں کو بالکل بے بس اور بے اقتدار دیکھ رہے ہیں انہیں اس کے بعد یہ پتہ نہ چلے گا اور وہ یہ محسوس نہ کریں گے کہ یہ بے بس ہیں اور ان کا کوئی اقتدار نہیں ہے اور نیز اس لئے کہ فضل واحسان تو خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

اب ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کلمہ نفی لا رکن کلام ہے یا نہیں اور بغیر اس کے معنی ناقص ہو جاتے ہیں یا نہیں کچھ اور مقامات جہاں لا کو زائد سمجھا گیا ہے۔

(۱) سورہ اعراف کی آیت:

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ (اعراف۔ ۱۲)

کہا کون سی چیز تجھے مانع ہوئی کہ تو سجدہ نہ کرے جبکہ میں نے تجھے حکم دیا کہا میں اس سے بہتر ہوں مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے تو نے مٹی

سے پیدا کیا ہے۔ یہاں بھی صاحب کشاف نے کہا ہے کہ الا تسجد میں لا زائد ہے اس دلیل سے کہ دوسری جگہ قرآن میں سورہ ص میں ہے:

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ (ص۔ ۷۵)

تجھے کون امر مانع ہوا اس سے کہ تو سجدہ کرے اسے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا

اور یہ ویسا ہی ہے جسے لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ کے معنی ہیں لِيَعْلَمَ:

میں کہتا ہوں کہ جو شخص سورہ اعراف اور سورہ ص دونوں جگہ کی آیتوں پر غور کرے اس کی سمجھ میں آئے گا کہ لا زائد نہیں ہے بلکہ سورہ اعراف میں لا اشارہ کے لئے آیا ہے اس امر کی طرف جس کی سورہ ص کے آیات میں صراحت ہے۔

بات یہ ہے کہ کوئی کام جو وقوع میں نہ آئے تو اس کے وقوع سے جو امر مانع ہوتا ہے جیسے: ضد، ملامت، غفلت، عاجزی یا کاہلی اور وہ باعث ہوتا ہے اس کے ترک کا اور تعمیل حکم سے روگردانی کا محرک ہوتا ہے سورہ ص میں پہلے مقام سرزنش میں مانع پوچھ گیا ہے ان الفاظ میں کہ ''تجھے کون سا امر اس سے مانع ہوا کہ تو سجدہ کرے'' اور پھر اس مانع کو ظاہر کر دیا گیا۔۔ یہ کہہ کر کہ:

اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝ (ص۔ ۷۵)

تو نے کیا گھمنڈ سے کام لیا یا تو اونچے لوگوں میں سے ہے۔

اور سورہ اعراف میں مانع کو دریافت کیا گیا ہے جو باعث ترک سجدہ ہوا۔ معنی کلام کے یہ ہیں کہ سجدہ سے کون سا امر مانع تھا جس کے باعث تو نے سجدہ نہ کیا؟ اور پھر شیطان کی زبانی اس باعث کو ظاہر کیا ہے کہ:

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا۔

(۲) سورہ طٰہٰ آیت

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ○ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ○ (سورۂ طٰہٰ آیت ۔۹۲۔۹۳)

(موسیٰ ؑ نے) کہا اے ہارون کیا امر تمہیں مانع ہوا جب تم نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہوگئے کہ تم میرے پیچھے نہ آؤ تو کیا تم نے میرے حکم سے عدول کیا؟

یہاں اَفَعَصَيْتَ کی ف (جس کا ترجمہ ''تو'' ہے) یہ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے پیچھے آنے کا مانع جو باعث ہوا عدولِ حکمی کا، دریافت کیا گیا ہے۔ مگر صاحب کشاف نے یہاں بھی کہا ہے کہ لا زائد ہے۔ معنی یہ ہیں کہ کیا امر تمہیں مانع ہوا اس سے کہ تم میرے پیچھے آؤ۔

(۳) ارشاد الٰہی ہے:۔

وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. (انبیاء۔۹۵)

اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا اس پر حرام ہے کہ وہ نہ پلٹیں۔

کشاف میں ہے کہ پلٹنے سے مراد کفر کو چھوڑ کر اسلام کی طرف رجوع ہونا ہے اور لا زائد ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے کہ پلٹنے سے مراد اسلام کی طرف پلٹنا لیا جائے تا کہ لا زائد قرار پائے۔ کیوں نہ اس سے مراد لیا جائے توبہ وانابت اور اقرار ایمان کی طرف رجوع ہونا آثار عذاب کے دیکھنے کے بعد جیسے فرعون کا اقرارِ ایمان ڈوبنے کے وقت جس کا ذکر سورۂ یونس میں ہے۔ یا جس کا تذکرہ سورۂ نساء میں ہے۔

اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ. (نساء۔۱۸)

جب ان میں سے کسی کے سر پر موت آ کر کھڑی ہو تب وہ کہے کہ میں اب توبہ کرتا ہوں

اور جیسا کہ سورہ مومنون میں مشرکوں اور ظالموں کے تذکرہ میں ہے

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ. (مؤمنون۔۹۹۔۱۰۰)

جب ان میں سے کسی کو موت آنے لگتی ہے تو وہ کہتا ہے اے پروردگار مجھے واپس کر دے شاید کہ میں اب نیک اعمال کروں تو یہ سب توبہ وانابت کی طرف رجوع کی مثالیں ہیں مگر آثار عذاب کے مشاہدہ کے بعد یہ رجوع قبول نہ ہوگی بس اسی طرح اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ ان بستیوں والے جنہیں اللہ نے ہلاک کیا ان پر حرام ہے یعنی ناممکن ہے فطری طور پر کہ وہ عذاب کے آثار دیکھنے کے بعد اقرار ایمان اور توبہ وانابت کی طرف رجوع نہ ہوں۔

(۴) سورہ آل عمران کی آیتیں:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ (آل عمران۔۷۹۔۸۰)

کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا کرے پھر

وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کو میرے بندے بن جاؤ بلکہ (وہ تو یہی کہیں گے کہ) اللہ والے بنو اس بناء پر کہ تم کتاب الٰہی کی تعلیم دیتے رہو اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہو اور نہ یہ کہ وہ حکم دے کہ تم فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا بنالو۔ اس میں لا یامرکم کا عطف ہے یقول پر جس کا ثُمَّ کے ساتھ عطف تھا ما کے بعد والے جملہ منفی پر یعنی یہ حق نہیں کہ وہ یوں کہے اور نہ یہ کہ وہ حکم دے تو یہ بعد کی نفی اس پہلی نفی میں زور پیدا کرنے کے لئے ہے جیسے دوسرے قول کے طور پر کشاف نے بھی درج کیا ہے اور کہا ہے کہ اس صورت میں لا زائد نہیں ہوگا۔

مذکورہ بالا آیات میں لا کو زائد قرار دینے میں زمخشری منفرد نہیں ہیں بلکہ بہت سے مفسرین اور نحویین اس توہم میں مبتلا ہیں۔

حالانکہ اگر کلام عرب میں لا کا زائد ہونا نظم اور نثر میں رائج ہو تب بھی ان آیات قرآن میں جب کہ نفی کی صورت میں معنی بنتے ہیں تو لا کو زائد قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں اور حقیقت کلام عرب میں بھی سوا شاذ و نادر اکا دکا اشعار کے جنہیں انہی زائد کہنے والوں نے تلاش سے نکال کر درج کیا ہے اور اہم ان اشعار کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس دور میں کہے گئے ہیں باقی ہمیں عام طور پر اس کی مثالیں نہیں ملتیں۔

بعض آیات قرآن میں تو زمخشری نے بھی لا کے زائد کہنے والوں سے اتفاق نہیں کیا ہے جیسے سورہ انعام میں:

وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ أَنَّهَآ إِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُونَ (انعام۔۱۰۹)

اور تمہیں بھلا کیا خبر کہ جب وہ معجزے آئیں گے تب بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اور اسی سورہ میں:

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا (انعام۔۱۵۱).

کہیے کہ آؤ میں بیان کروں تم سے وہ باتیں جن کی تمہارے پروردگار نے تم پر پابندی عائد کی ہے تم شرک نہ کرو۔

مگر سورہ نساء کی اس آیت میں کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ.(نساء۔۶۵)

تو نہیں قسم تمہارے پروردگار کی وہ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو ثالث نہ مانیں۔

لکھ دیا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ کے معنی ہیں: فَوَرَبِّكَ جیسے دوسری جگہ ہے: فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ ''تو قسم تمہارے پروردگار کی ہم ان سے ضرور سوال کریں گے''۔ یہاں لا بڑھا یا گیا ہے قسم کے مضمون کو پرزور بنانے کے لئے جیسے: لِئَلَّا يَعْلَمَ میں بڑھایا گیا ہے علم کی ضروری ہونے پر زور دینے کے لئے۔

ان چند سطروں میں جو انتشار خیال ہے وہ قابل عبرت ہے اور اتنی تفصیل اس بحث کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ شریف رضی نے حقائق التاویل میں بعض لوگوں کا قول واؤ کی زیادتی کے بارے میں چند آیات قرآن کی ذیل میں نقل کیا ہے مثلاً سورہ آل عمران میں وَلَوِ افْتَدٰى بِهٖ اور سورہ ابراہیم ہیں: وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ اور سورہ زمر میں: وہ واؤ عطف ہے ایسے معطوف کے ساتھ جس کا معطوف علیہ لفظاً محذوف ہے مگر سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ اور بھی مقامات پر یہ علمائے نحو کا اسلوب قرآن سمجھنے سے قاصر ہونا ہے جس کی بناء پر ان کے تردد اور اضطراب کی وجہ سے دشمنان قرآن کو قرآن پر اعتراضات کا

موقع ملا ہے اور اس کے بعض نمونے اور ان کی تشریح کتاب الہدی حصہ اول میں اور بالخصوص تیرہویں مقدمہ میں ۱۲۱ ۳ سے آخر کتاب تک سیر حاصل طور پر گئی ہے۔

ان صاحبان فن کی فنکاریوں سے قرآن فہمی میں دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت سے قرآنی محاورات واستعارات صدر اسلام میں کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں سمجھے گئے اور بعد میں جبکہ فطری ادب عربی کی بہار خزاں سے بدل گئی تو وہ معرکۃ الآرا مسائل بن گئے۔ جیسے ”اضلال“ کی نسبت خداوند عالم کی جانب جو بہت سے آیات میں ہے وہ حقیقۃً انسانی نفس اتارہ کی دسیسہ کاریوں کے ساتھ توفیق الٰہی کے سہارے کی ضرورت ثابت کرنے والی ایک نہایت حسین مجازی تعبیر تھی جس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ انسان کی بداعمالی کا ایک درجہ وہ ہوتا ہے کہ انسان کو اس کے نفس کے سپرد کر دیا جائے جس کا اثر انسان کی گمراہی کی شکل میں ویسا ہی قوت کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ جیسا گمراہ کرنے کا اثر ہو سکتا ہے اسی شباہت کے لحاظ سے بطور استعارہ اس کی تعبیر اضلال یعنی گمراہ کرنے کے ساتھ ہوئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو توفیق الٰہی کی نعمت کی قدر ہو۔

ضلال کے اطلاق میں اس مجازی پہلو کا قرینہ قرآن کی وہ صاف آیتیں ہیں جیسے سورہ اعراف میں: آیت ۲۸

إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ

بیشک اللہ برے کام کی تحریک نہیں کرتا

اور سورۂ نحل میں

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ (النحل۔۹۰)

بلاشبہہ اللہ عدالت، بھلائی اور صاحبان قرابت کے حقوق کی ادائیگی کے لئے تحریک کرتا ہے اور شرمناک کام برائی اور ظلم وتعدی سے روکتا ہے اس طرح تمہیں نصیحت کرتا ہے شاید تم اثر قبول کرو۔

اللہ کا اپنی ثنا وصفت میں اسے بیان کرنا کہ وہ اچھائی کی تحریک کرتا اور برائی سے روکتا ہے اس کا قطعی ثبوت ہے کہ گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف مجاز ہے۔ اور بھلا گمراہ کرنے کی نسبت اس کی طرف بطور حقیقت کیوں کر ہو سکتی ہے جبکہ وہ گمراہوں کی مذمت کرتا ہے۔ انہیں ان کی گمراہی پر سزا دیتا ہے اور ان کی طرح طرح سے سرزنش کرتا ہے مثلاً:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ / لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ / لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَمَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ / فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ / وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا.

کیوں کر تم اللہ کا انکار کرتے ہو کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو۔ کیوں اللہ کے راستے سے روگردانی کرتے ہو؟ تو کیا ہو گیا ہے تمہیں! تم کیسے فیصلے کرتے ہو۔ تو انہیں کیا ہو گیا ہے کہ یہ ایمان نہیں لاتے۔ تو آخر انہیں کیا ہے کہ وہ نصیحت سے روگردانی کرتے ہیں اور آخر ان کا کیا نقصان تھا اگر وہ ایمان لاتے۔

یہ بحث تفصیلی طور پر علم کلام کے کتب میں درج ہے اور کافی حد تک حصہ سوم رحلہ مدرسہ ۲۹ تا ۴۲ ہیں موجود ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید کی آیت الرحمن علی العرش استوی ہے جس میں قرآن مجید کے واضح آیات اور عقلی دلائل پر جو قطعی ہیں، اگر نظر

رکھی جاتی تو سمجھ میں آتا کہ عرش سے یہاں پر شان قدرت وجلال اور ازل وابد میں عالم ملکوت پر اس کا اقتدار مراد ہے اور ہماری کوتاہ ذہنیتوں کے لئے جو محسوسات کے دائرہ میں گرفتار ہیں، اس کی تشبیہ دی گئی ہے اس تخت سلطنت سے جس پر سلاطین زمانہ متمکن ہوتے ہیں لیکن ظاہر پرستوں کی اس عجوبہ آفرینی کو کیا کیا جائے کہ ابن مردویہ اور خطیب نے اپنی تاریخ میں اور ابن منصور نے اپنے سنن میں حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بروایت عمر بن الخطاب یہ حدیث درج کردی۔ اسی آیت الرحمن علی العرش استوی کے ذیل ہیں کہ وہ عرش پر اس طرح بیٹھتا ہے کہ عرش کے چر چرانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کنیز العمال جلد ۶ ۲۲۶ اور منتخب کنز العمال میں بھی یہ احادیث درج ہیں۔ میزان الاعتدال ذہبی میں عَسٰی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ کی تفسیر میں مجاہد کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا حضرت کو عرش پر اپنے پاس بٹھائے گا۔

کنا شو اھد الحق شیخ یوسف نبہانی ۱۳۰ پر ہے کہ ابن تیمیہ کے تصانیف سے ایک کتاب العرش ہے۔ کشف الظنون میں ہے کہ اس میں لکھا ہے کہ اللہ عرش پر بیٹھتا ہے اور اس میں ایک جگہ خالی رکھی ہے جس میں رسول خدا اس کے پاس بیٹھیں گے۔ جیسا کہ ابو حیان نے آیت قرآن وسع کرسیہ السموات والارض کی تفسیر میں درج کیا ہے اور اس میں بھی احمد بن تیمیہ کی کتاب العرش کا حوالہ دیا ہے اور اسی آہنگ پر محمد بن عبدالوہاب نجدی کا ترانہ ہے۔ اپنے مطبوعہ رسالہ میں جو دیگر رسائل کے ساتھ ایک مجموعہ کے اندر مکہ معظّمہ میں طبع ہوا ہے اور صفحہ ۱۵۵ و ۱۵۶ میں یہی باتیں اسی میں درج ہیں۔

یہ ہے بقدر ضرورت سرکار بلاغی کے افادات کا خلاصہ